حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
پٹنہ

فردنامہ-٦

علامہ واقف عظیم آبادی

ڈاکٹر نسیم اختر

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۶

Waqif Azeemaabadi

By

Dr. Nasim Akhtar

نام کتاب	:	واقف عظیم آبادی
مصنف	:	ڈاکٹر نسیم اختر
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	128
کمپوزنگ	:	مسیح الرحمٰن قاسمی
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ : 9334020186

ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی۔ بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2253093، ای میل : directorurdu@gmail.com

GOVT. URDU LIBRARY
ACC. No. 28388
Date 22/11/2001
PATNA

مشمولات

- پیش لفظ: امتیاز احمد کریمی ۴
- علامہ واقف : ایک معروضی تعارف اسلم جاوداں ۶
- ابتدائیہ: ڈاکٹر نسیم اختر ۹

عنوانات

- علامہ واقف: ایک نظر میں ۱۲
- احوال وکوائف ۱۵
- واقف: ایک درویش ۳۴
- آرا کا شعری پس منظر ۴۰
- واقف بحیثیت شاعر ۴۴
  - الف ۔ غزل گوئی ۴۴
  - ب ۔ نظم نگاری ۵۴
  - ج ۔ طنز وتغزل ۶۳
  - د ۔ واقف آرٹ ۷۲
- واقف بحیثیت نثر نگار ۸۲
  - الف ۔ تنقید ۸۲
  - ب ۔ صحافت ۹۷
  - ج ۔ تصوف ۱۰۱
- واقف : ایک اجمالی جائزہ ۱۰۸
- انتخاب کلام واقف ۱۱۴

Govt. Urdu Library
38388

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، فضل حق آزاد، شوق نیموی، انجم مانپوری، یاس یگانہ چنگیزی، بیدل عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجز، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، رمز عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کر سکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدر دان ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمز عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فرد نامے شائع کئے جا رہے ہیں۔

دبستان بہار کی ایک اہم ادبی وشعری شخصیت کا نام واقف عظیم آبادی ہے۔ ان کی پیدائش ۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو ارول (جہان آباد) میں ہوئی۔ ۴ر سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ ان کو لے کر آرہ چلی آئیں اور محلہ چودھرانہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئیں۔ جہاں اُن کی عمر کا طویل حصہ گزرا۔ ۱۹۶۶ء میں وہ شادی کے بعد اپنی سسرال گولک پور، پٹنہ میں ہی بس گئے۔ اسی لئے کچھ لوگ ان کو واقف عظیم آبادی اور کچھ لوگ واقف آروی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

واقف عظیم آبادی کو فارسی، عربی اور اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ سخنور تھے۔ طویل عرصے تک پٹنہ کے روز نامہ 'سنگم'، 'صدائے عام'، 'قومی تنظیم' اور 'ہمارا نعرہ' میں واقف آرٹ کے عنوان سے مزاحیہ قطعات لکھتے رہے اور علامہ واقف کے نام سے شہرت مقبولیت اور عزت حاصل کرتے رہے۔ وہ ایک قادر الکلام اور غضب کے ذہین شاعر تھے۔ وہ فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ لوگ اُن سے گھنٹے بھر میں طویل سہرے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ اس فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

واقف عظیم آبادی بڑے کثیر المطالعہ اور دانشوارانہ صلاحیتوں کے حامل شاعر وادیب تھے۔ ان کی علمی و دانشوارانہ اہمیت کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کو ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک روزانہ لائبریری میں مدعو کیا اور انھیں اپنی یادداشت قلم بند کرنے کو کہا۔ واقف کی یہ قیمتی تحریر لسانی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی اعتبار سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں اور یہ خدا بخش لائبریری میں بارہ جلدوں میں محفوظ ہے۔

اس فرد نامہ کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر ایک اچھے محقق، مبصر، صحافی، ادیب اور ناقد ہیں۔ اردو زبان صحافت اور ادب سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک بہترین محقق ہیں اور ان کی تحریریں تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ ملک کے صف اول کے دانشواران ادب اور ناقدین نے نسیم اختر کی تحریر وتصنیف کی ستائش کی ہے۔ ۱۔ تاثرات ۲۰۰۲ء، ۲۔ نیپال میں اردو ۲۰۰۴ء، ۳۔ تلاش وتصنیف ۲۰۱۳ء، ۴۔ طرز سخن ۲۰۱۴ء، ۵۔ باتیں ۲۰۱۵ء، ۶۔ رنگ وآہنگ ۲۰۱۶ء تحقیقی نوعیت کی قابلِ مطالعہ کتابیں ہیں۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

علامہ واقف: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

علامہ سید شاہ فضل امام واقف عظیم آبادی کی پیدائش ۱۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو اروں (سوسنہ) ضلع جہان آباد میں ہوئی۔ والد کا نام سید شاہ منظر امام اور والدہ کا نام صفیہ خاتون تھا۔ ان کا تعلق ایک زمیندار اور ادبی خانوادے سے تھا۔ معروف افسانہ نگار شکیلہ اختر اُن کی چچا زاد بہن تھیں اور سرکردہ افسانہ نگار ادیب وشاعر اختر اورینوی اُن کے چچا زاد بہنوئی تھے۔ چار سال کی عمر میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اُن کی والدہ علامہ واقف کو لے کر آرہ کے محلّہ چودھرانہ میں مستقل قیام پذیر ہوگئیں، وہیں اُنھوں نے بڑی حکمت اور عزم وحوصلے سے اُنھیں پالا پوسا، پروان چڑھایا۔ اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، پھر اُنھوں نے مدرسہ حنفیہ، میر گنج آرہ میں تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی سند پائی۔ آزادی کے بعد جب زمینداری کا خاتمہ ہوا تو ساری جائداد جیسے تیسے فروخت ہوگئی۔ علامہ واقف ۱۹۶۶ء میں اپنی سسرال گولک پور پٹنہ میں مستقل سکونت پذیر ہوگئے اور یہیں شعروشاعری کو اپنے اہلِ خاندان کے لیے ذریعہ کفالت بنایا۔

علامہ واقف کی شادی ۱۹۴۴ء میں مسوڑھی (ضلع پٹنہ) کے ڈاکٹر عبدالحمید کی صاحبزادی نفیسہ خاتون سے ہوئی، جن سے اُنھیں پانچ بیٹیاں، شفقت خاتون، فردوسی خاتون، مسرّت جہاں، شاد مانی جہاں، شادابی خاتون اور ایک بیٹا اکبر امام کاشف ہوئے۔

اپنی بے مثال علمی وادبی صلاحیت کے سبب واقف عظیم آبادی دنیائے شعروادب میں علامہ واقف کے نام سے مشہور ومعروف ہیں۔ ان کی شاعری زمینی حقائق سے پیوستہ اور شعری حسن سے آراستہ ہے۔ پٹنہ کے روزناموں 'سنگم' 'صدائے عام'، 'ہمارا نعرہ' وغیرہ میں ان کے قطعات ''واقف آرٹ'' اور ''واقفیات'' کے نام سے شائع ہوتے رہے، جس سے اُنھیں عوام وخواص میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس عنوان کے تحت سماجی، سیاسی، مذہبی، لسانی، قومی وبین الاقوامی مسائل پر طنزیہ ومزاحیہ انداز میں قطعات لکھ کر اپنی ایک الگ شناخت حاصل کی۔ سنجیدہ شاعری میں بھی علامہ واقف کا ایک منفرد اور اعلیٰ

مقام ہے۔ بہار میں اپنی طرز کے وہ ایک منفرد اور ممتاز اردو شاعر تھے۔ ان کی تخلیقات جس قدر مشاعروں میں پسند کی جاتی تھیں، اسی قدر اردو روزناموں کے توسط سے اردو آبادی میں بھی مقبول تھیں۔

پروفیسر عبدالوہاب اشرفی نے علامہ واقف کی شعری وادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''سید شاہ فضلِ امام واقف عظیم آبادی جنہیں لوگ علم اور مرتبہ کی وجہ سے علامہ واقف کے نام سے یاد کرتے ہیں، متعلقہ سرزمین کی ایک پُر بہار اور پُر وقار شخصیت کا نام ہے۔ وہ خود تو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے؛ لیکن اپنی گراں بہا نگارشات کا ایسا سرمایہ چھوڑ گئے، جسے نہ صرف یادگارِ واقف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؛ بلکہ سیاست، تہذیب اور شعر و شاعری کے ضمن میں ایک قیمتی تحفہ کے طور پر محفوظ کیا جا سکتا ہے.... علامہ زبان و بیان پر غایت دسترس اور قدرت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں الفاظ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح نظر آتے ہیں''۔

علامہ واقف ایک شانِ استغنا کے حامل تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی کتابوں کی تدوین اور اشاعت کی پروا نہیں کی، لہٰذا ان کے ذریعہ شائع کردہ کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات ہزاروں ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، جن کی تدوین کے بعد ایک درجن سے زائد بیش قیمت کتابیں معرضِ وجود میں آسکتی ہیں، لہٰذا ان کی علمی وادبی حیثیت کے پیشِ نظر اصحابِ فکر و نظر نے ان کی کچھ تخلیقات مدون کر کے کتابی شکل میں شائع کیں ہیں۔ ان کی علمی، ادبی و تاریخی معلومات اور قاموسی ذہن کے پیشِ نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار نے ان سے بہار اور ان کے آبائی شہر آرہ کی مکمل تاریخ طویل عرصے تک قلم بند کروائی، جس میں سرزمین آرہ اور ریاست بہار کے علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی تمام پہلوؤں پر بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ان کی تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

واقف عظیم آبادی تقریباً ۶۰ برسوں تک نثری اور شعری تخلیقات میں سرگرم رہے۔ اردو ادب میں ان کی خدمات بیش قیمت اور بے نظیر ہیں، جن کو مرتب اور مدون کر کے شائع کرنا ہمارا ادبی فریضہ ہے۔

انتقال: علامہ واقف کا انتقال ۶ ستمبر ۱۹۹۳ء کو تقریباً ۷۸ برس کی عمر میں آرہ میں ہوا۔

تدفین: علامہ واقف کو اُن کے آبادی قبرستان منشا پانڈے میں دفن کیا گیا۔

چند تصنیفات و تالیفات

(۱) لطفِ ستم (انتخاب کلام واقف) مرتب: سید جاوید حسن

(۲) رازہائے درونِ پردہ (شعری مجموعہ) مرتب: سید اکبر امام کاشف

(۳) گفتنی ناگفتنی (مزاحیہ شعری مجموعہ) مرتب: سید اکبر امام کاشف

(۴) گلدستۂ نعت و منقبت (نعت و منقبت کا مجموعہ)

(۵) تاریخ بہار (علامہ واقف کی یادداشت پر مبنی تاریخ بہار)

(۶) مضامین واقف عظیم آبادی (مقالوں کا مجموعہ)

چند منتخب اشعار

تجھ پہ تو یہ فرض ہے اے بے شعار زندگی
ٹوٹ جائے گا کسی دن یہ خمار زندگی

زباں پہ شکوۂ ایام آہی جاتا ہے
کچھ اس طرح بھی ترا نام آہی جاتا ہے

کون واقف ہے جسے نانِ شبینہ کی تلاش
وہ گدا گر بے نوا وہ شاعرِ خانہ خراب

عید کا دن ہے فریب یار کی باتیں کرو
اپنے سیکولر روزہ و افطار کی باتیں کرو

جو غلامِ درِ خواجہ نہیں ہونے پاتے
قطرے رہ جاتے ہیں دریا نہیں ہونے پاتے

پیری میں ہے رنگِ نوجوانی ساقی
رعنائی دل ہے زندگانی ساقی

نہ پوچھو مجھ سے زمانہ کو کیا دیا میں نے
یزیدیوں کو حسینی بنا دیا میں نے

چالاک ہے عیار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جو شخص ہے مکار ہے معلوم نہیں کیوں؟

لطفِ ہنگامۂ میخانہ بدل جائے گا
آپ کی فکر کا پیمانہ بدل جائے گا

خار زار زندگی کیا ہے گلستاں بوستاں
شرط ہے لیکن گل و گلزار کی باتیں کرو

ستم ہے مجھ پہ قسمت کا خدا کا قہر ہے مجھ پر
کہ میری آہ کو آتش فشاں ہونا نہیں آتا

نسیم صبح گر پھولوں کو خنداں کر نہیں سکتی
تو زیادہ دیر تک سیر گلستاں کر نہیں سکتی

آپ قطرہ سے اگر موج میں دریا ہو جائیں
لاکھوں طوفان جو پنہاں ہیں وہ پیدا ہو جائیں

زبانِ ثانوی بن کر ہوئی ہے جلوہ گر اردو
حکومت کا یہ سکہ ہے ادھر ہندی اُدھر اردو

بے آئینہ قلب سنورتی نہیں قومیں
بے روح نہ ہو جائیں تو مرتی نہیں قومیں

بے امتیاز فکر و نظر دیکھتے رہے
تازندگی وہ تازہ خبر دیکھتے رہے

رو کر کیا جہالتِ قومی کا تذکرہ
ہنس کر فساد علم و ہنر دیکھتے رہے

یہ واقف آرٹ کیا ہے سمجھ میں نہ آ سکا
احساں جناب کا ہے اگر دیکھتے رہے

مومن ہلاکِ لذتِ افطار ہو گیا
لیکن زباں پہ اس کے ہے جنت کی بات چیت

رکھتے ہیں وہ بلندیٔ گفتار فطرتاً
شکوے کا شائبہ نہ شکایت کی بات چیت

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

تقریباً پچیس سال کا طویل عرصہ میں نے علامہ شاہ سید شاہ فضل امام واقف ارولی، آروی، عظیم آبادی سے بہت قریب رہ کر گزارا۔ جس میں ۸۳-۱۹۸۰ء کا وہ زمانہ بھی شامل تھا جب میں روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کے حلقہ ادارت سے وابستہ تھا، جہاں علامہ کے بھی شب و روز کا زیادہ تر حصہ گزرتا تھا۔ دفتری اوقات میں شاید ہی ایسا دن ہو کہ انہوں نے اخبار کے لیے ''واقف آرٹ''، ''طنز و تغزل''، یا حالات حاضرہ پر کوئی مضمون نہ لکھا ہو۔ کبھی کبھی ''سنگم'' پٹنہ کا اداریہ بھی سپرد قلم کرتے تھے۔ یہ تو ''سنگم'' پٹنہ کے ساتھ ان کا معاملہ تھا، جو کئی دہائیوں سے بدستور جاری تھا۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے ''آؤٹ ڈور سروسیز'' کا سلسلہ بھی رہتا، چونکہ سبزی باغ کا علاقہ ایک زمانہ سے اردو پریس کو راس آتا رہا، لہٰذا میرا بارہا مشاہدہ رہا کہ کسی نہ کسی روزنامہ، یا ہفتہ وار سے کوئی اسٹاف آتا اور ان سے اپنی مطلوبہ ضروریات کی تکمیل کے ساتھ خوشی بخوشی رخصت ہوتا۔ انہیں مصروفیات میں وہ خوش گپی کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے اور کبھی کبھی ''سنگم'' کے دفتر سے نکل کر رکشہ لیتے، جو انہیں ہوٹل، خدا بخش لائبریری، یا ان کے کسی قدردان کے یہاں لے کر چل پڑتا۔ معمول تو یہ تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے وہ پھر اپنی جگہ انہیں واپس پہنچا جاتا اور اگر اسی دوران ان کا موڈ بدلا تو پھر ہفتہ دس روز تک غائب؛ یعنی کسی قدردان نے انہیں روک لیا، یا انہوں نے خود وہاں ڈیرہ جمالیا؛ کیوں کہ انہیں احساس تھا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں
مرا حق ہے فصل بہار پر

علامہ کی دانشوری اور سخنوری کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ان کی قلندرانہ طبیعت کے چرچے عام تھے۔ میں نے بھی مذکورہ خوبیوں کے علاوہ ان کی ذہانت و ذکاوت، غیر معمولی حافظہ، گہرے

مطالعہ، زود گوئی و برجستگی اور نثری تحریروں کا جادو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا وضع قطع بھی میرے سامنے تھا اور ان کی روحانی و وجدانی کیفیت بھی میری نگاہوں میں تھی، جلال و جمال بھی دیکھا اور خفگی و دشنام طرازیوں کا شکار بھی ہوا، البتہ میرے حق میں ان کی دعائیں زیادہ غالب رہیں۔ موصوف کے زبان و بیان کی اثر پذیری؛ بلکہ سحر انگیزی کا وہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جسے جو کہا وہ اکثر ہو بھی جاتا، جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔ غرض کیا شخصیت تھی، کیا تبحر علمی تھا، کتنا بلند مذاق اور بالیدہ شعور تھا، کیا بصیرت و بصارت اور فراست ایمانی تھی اور فاقہ مستی میں بھی کیا غضب کی آسودگی اور شگفتگی تھی۔

علامہ واقف اپنے زمانہ میں علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی آندھی تھے، جس کے سامنے چراغوں کی لو تھر تھر کانپتی اور اپنے وجود کی بقا کے لیے دہائی دیتی نظر آتی۔ افسوس کہ ان کی بے نظیر تخلیقات کچھ تقسیم ہند کی نذر ہو گئیں، کچھ نقل مکانی میں اخباروں کی فائلوں کی زینت بن کر رہ گئیں۔ قابل مبارک باد ہیں سید جاوید حسن جنہوں نے ان کی شاعری کا ایک مختصر سا مجموعہ ''لطف ستم'' اور اکبر امام کاشف نے ''راز درون پردہ'' اور ''مضامین واقف عظیم آبادی'' میں کچھ باقیات محفوظ کر دیں۔

ایک زمانہ سے مجھے اس کا شدید احساس رہا کہ علامہ واقف جیسی عبقری شخصیت اور ان کی ادبی و شعری خدمات پر مختلف پہلوؤں سے کام کرنے اور انہیں منظر عام پر لانے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے احوال و آثار ایک نہیں کئی سیمیناروں کی متقاضی ہیں، تا کہ علم و ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کیا جا سکے۔ افسوس کہ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں جن کے ہاتھوں میں اردو اخبار و رسائل کی باگ ڈور رہی انہوں نے بھی واقف کو نظر انداز کیا۔ سرکاری عنایات سے بڑے بڑے سیمیناروں کے دعویداروں نے بھی چشم پوشی کی یا پھر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ واقف جیسے قد آور اور نابغۂ روزگار کے کارناموں تک رسائی کا انہوں نے خود کو اہل نہیں سمجھا۔ راقم نے اپنی کتاب ''تلاش و تصنیف'' (۲۰۱۳ء) میں ''کچھ سربستہ تخلیق کا انکشاف'' عنوان کے تحت ۳۳ صفحات پر مشتمل ایک مضمون شامل کیا ہے جو واقف کی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کی ہلکی سی جھلک پیش کرتا ہے۔

خدا بھلا کرے اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، بہار، پٹنہ کے ارباب حل و عقد کا جنہوں نے ۱۸ر مارچ ۲۰۱۸ء کو واقف پر ایک ''یادگاری تقریب'' منعقد کی اور اس موقع پر ایک دیدہ زیب تعارفی فولڈر بھی شائع کیا، جس میں ایک جگہ یہ جملہ بھی درج ہے: ''ان کی تخلیقات ہزاروں

صفحات پر مشتمل ہیں، جن کی تدوین کے بعد ایک درجن سے زائد بیش قیمت کتابیں معرض وجود میں آسکتی ہیں''۔

میں ممنون ہوں جناب امتیاز احمد کریمی ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ اور ڈاکٹر اسلم جاوداں، اردو پروگرام آفیسر، اردو ڈائرکٹوریٹ کا کہ علامہ واقف پر جن کی نگاہ انتخاب پڑی۔ یہ مختصر سی کتاب انہیں حضرات کی تحریک و ترغیب کا نتیجہ ہے۔ متعین اوقات اور محدود صفحات میں جو کچھ ہو سکتا تھا، اسے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، اس موضوع پر کسی بھی تفصیلی کتاب کے لیے اسے محض ایک نقش اول سمجھنا چاہیے۔

یہ بھی المیہ ہے کہ اس کی تصنیف کے ابتدائی مراحل میں ہی میں ناگہانی مکروہات و حادثات کی زد میں آگیا، یہاں تک کہ اس کی تکمیل کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایسے میں علم و ادب کی دو اہم شخصیت پروفیسر محسن رضا رضوی، صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج پٹنہ سٹی اور پروفیسر احمد بدر، شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور نے میرے حوصلوں کو شکست خوردگی سے بچا لیا اور میں اس قابل ہو سکا کہ یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ احمد بدر اور محسن رضا رضوی صاحبان نے اپنی مصروفیات کے باوجود واقف سے متعلق چند اہم نکات سے مجھے آگاہ کیا۔ خدا انہیں مزید علمی ترفع عطا کرے تاکہ معاصرین کے علاوہ متعاقب نسل بھی ان سے علمی و تحقیقی استفادہ کرتی رہے۔

میں جناب مسیح الرحمن قاسمی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے کتاب کی مپوزنگ کی۔ میرے شکریہ کے مستحق جناب حامد حسین ندوی بھی ہیں، جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود کتاب کے مسودے پر ایک نظر ڈال کر اسے قابل اشاعت بنایا۔

ڈاکٹر نسیم اختر

پٹنہ سیٹی، پٹنہ

علامہ واقف: ایک نظر میں

نام	:	سید شاہ فضل امام
تخلص	:	واقف
خطاب و لقب	:	علامہ اور لسان الملک
مولد		اروں (قدیم ضلع گیا، اب اروں خود ضلع ہے)
پیدائش		۱۸ر مارچ ۱۹۱۶ء مطابق ۱۳ر جمادی الاولی ۱۳۳۴ھ پروز شنبہ
دادیہال		اروں
نانیہال		آرہ، محلہ چودھرانہ
جد امجد		حضرت سید شاہ مخدوم شمس الدین سمن باز، اروں
والد	:	سید شاہ منظر امام
والدہ		بی بی صفیہ خاتون (متوفی ۳ر اپریل ۱۹۶۶ء)
دادا		سید شاہ حزبر امام
نانا		چودھری منظور احمد
رہ خورنی		۱۹۱۹ء عید کے دن کسی نے انہیں زہر دے دیا، حکیم جمیل خاں کے زیر علاج رہے اور شفایاب ہوئے
رسم بسم اللہ		۱۹۲۰ء مطابق ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۳۷ھ چار سال چار ماہ، چار دن کی عمر میں امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدر الدین پھلواروی سے تاریخ

مادرانِ علمی	:	(الف) والدہ ماجدہ کے زیرِ نگرانی
		(ب) مدرسہ حنفیہ میر گنج آرہ سے مولوی
		(ج) مدرسہ وحیدیہ آرہ سے عالم
		(د) مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت
تلامذہ	:	حضرت علامہ تمنا عمادی پھلواروی
سفر فرنگی محل لکھنؤ	:	۱۹۳۱ء
سب سے پہلا شعر (۱۲ سال کی عمر میں)	:	اگر بکرا مارے گا بکری کو سینگ تو بکری بھی مارے گی بکرے کو سینگ
مشاعرے کے لیے کہی گئی سب سے پہلی غزل		۱۹۳۸ء، منعقدہ رہائش گاہ واقف عظیم آبادی، آرہ زیرِ صدارت حضرت تمنا عمادی پھلواروی
منکحت	:	شاکرہ خاتون بنت ڈاکٹر عبدالحمید، مسوڑھی پٹنہ
اولاد		۵ لڑکیاں اور ایک لڑکا
ادبی صحافت کا پہلا دور		۱۹۴۷ء کے پہلے سے خصوصی طور پر الکوثر، ریاست، روزنامہ ہند، الفقیہ، انقلاب
مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات		۱۹۴۶ء، گاندھی سنگر ہالیہ، پٹنہ
معاشی زوال کی ابتدا	:	۱۹۴۷ء کے بعد سے
آرہ سے پٹنہ مراجعت		۱۹۶۶ء
روزنامہ سنگم سے وابستگی		۱۹۶۶ء سے
ہفتہ وار طشت از بام کا اجرا	:	۱۹۷۲ء
راج بھون بہار کی دعوت		۱۸/اکتوبر ۱۹۷۹ء (گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی کی ضیافت)
بزم واقف کی بنیاد	:	غالباً ۱۹۷۲ء
دہلی کا سفر	:	۱۹۸۰ء

اجمیر کا سفر	:	۱۹۸۳ء
محکمہ راج بھاشا اردو سے وظیفہ مقرر	:	۲۲؍اکتوبر ۱۹۸۸ء
		زیر مہتمم خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
نگارشات و تصنیف	:	کل ۱۲؍جلدوں میں، ۹۳۔۱۹۸۵ء کے دوران
پٹنہ سے آروہ روانگی		۵؍دسمبر ۱۹۹۳ء
وفات		۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء
تدفین	:	منشا پاٹنے کا باغ، آرہ، ۷؍دسمبر بعد نماز عصر

احوال وکوائف

پیدائش اور خاندانی پس منظر

اردو کے معروف شاعر، صاحب طرز نثر نگار اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل علامہ سید شاہ فضل امام واقف کی پیدائش ۱۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو موجودہ ضلع ارول (قدیم ضلع گیا) میں ہوئی، جو دریائے سون کے کنارے واقع ہے۔ یہ وہی سون ہے، جس سے اختر اورینوی نے اپنے جذباتی لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نظم "دریائے سون" میں کہا تھا

وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے
دامن میں لیے جلوۂ رنگیں کے شرارے
ہیں اختر بیتاب کو سو جان سے پیارے
اے سون بلالے تو مجھے اپنے کنارے

واقف عظیم آبادی کی دادیہال ارول، نانیہال آرا، وطن ثانی پٹنہ یعنی عظیم آباد تھا اور یہ تینوں مقامات انہیں عزیز تھے، چنانچہ انہیں نسبتوں سے وہ اپنے نام اور تخلص کے ساتھ پورے اہتمام سے تاحیات ارولی، آروی اور عظیم آبادی لکھتے رہے۔ البتہ سولہ، سترہ سال کی عمر تک وہ صرف واقف آروی لکھتے تھے۔ اپنی قادر الکلامی اور تبحر علمی کی وجہ سے 'علامہ' اور 'لسان الملک' جیسے خطابات والقاب سے معروف ہوئے۔ نسبی اور روحانی طور پر واقف کا تعلق اس صوفی خانوادے سے تھا، جو

تقریباً نو سو سال کے طویل عرصے سے بالخصوص بہار اور بالعموم برصغیر ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ سری لنکا اور برما میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کیے ہوئے تھا۔ ان کے جد امجد حضرت سید شاہ مخدوم شمس الدین سمن بازار ولی تھے، جو مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے خالہ زاد حضرت مخدوم تیم الدین چشتی کے مجاز یافتہ خلیفہ تھے۔ شاہ سمن ارولی سے اپنی نسبت و عقیدت ظاہر کرتے ہوئے واقف کہتے ہیں:

لوحِ محفوظ ترا عرشِ معلیٰ تیرا
شاہ سمن ہے خداداد یہ رتبہ تیرا
بڑھ گئی سید جیلاں کی عنایت مجھ پر
انہیں معلوم ہوا جب ہوں میں پوتا تیرا
طبع واقف کی روانی ہے کرامت تیری
موج در موج ہمیشہ ہے یہ دریا تیرا

واقف کے نانیہال کے افراد بھی اپنے عہد کے ممتاز و مشہور علمی و ادبی زمینداروں میں تھے۔ واقف کے پردادا سید شاہ عزیز حسین اپنے عہد کے جید عالم دین تھے۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی کی کتاب "تقویۃ الایمان" جب منظر عام پر آئی تو اس کے خلاف سب سے پہلے فتویٰ انہوں نے ہی دیا تھا۔ ان کے بعد علامہ فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علمائے فقہ کے سامنے آئے۔ ان کے دادا سید شاہ اظہر حسین اپنے عہد کے انتہائی خوش حال زمین دار تھے۔ شعر و سخن میں بھی یکتائے زمانہ تھے۔ وہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے نانا چودھری منظر حسین مخلص چودھری، آرائے رئیس اور اپنے زمانے کے قادر الکلام شاعروں میں تھے۔ ان کا کلام مرزا عنایت بیگ عنایت آروی تلمیذ صفیر بلگرامی کے اخبار "آفتاب عالم" آرا کے علاوہ آرا کے قدیم گلدستوں میں موجود ہے۔ واقف کے والد سید شاہ منظور امام کا شمار بھی ارولی کے رؤسا اور فرزانہ شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ داغ دہلوی کے عقیدت مندوں اور علی احمد حشرت کیوی کے حلقہ تلامذہ میں تھے۔ خوش وضع، خوش فکر، سخن اور علم و ادب کے ساتھ جاہ و منصب، فارغ البالی، فیاضی، دولت و ثروت اور رعب و دبدبہ خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس گھرانے کی سخاوت سے خاص و عام فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔

چودھری شرافت حسین (ایم ایل سی)، چودھری ریاست حسین (سول سرجن)، چودھری وجاہت حسین (ڈپٹی گورنر ریزرو بینک آف انڈیا، بمبئی) اور چودھری حفاظت حسین (کمشنر بنارس) واقف کے حقیقی ماموں تھے۔ ملک کی دیگر قد آور اور معروف شخصیتوں میں سید شاہ عمیر (ایم پی) جنگ آزادی کے ممتاز سالاروں میں تھے، جن کی قیادت میں ہندو مسلم اتحاد نے انگریزی حکومت کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس خاندان کی قربانیاں دوسرے مجاہدین آزادی سے کم نہ تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی بعض خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ رہیں، جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد پر ملک کی آزادی کے مفاد کو ترجیح دی۔ سید شاہ محمد زبیر اور سید شاہ زبیر بھی واقف کے چچا تھے۔ جناب صدیقی کی کتاب ''معمار قوم محمد زبیر بار ایٹ لا'' اس خاندان کے کارناموں کی ایک اہم دستاویز ہے۔ یہی خاندانی سلسلہ سید شاہ مشتاق احمد سے ہوتا ہوا سید شاہ عارق انور (سابق رکن پارلیمنٹ) تک جا پہنچتا ہے۔ دیگر ممتاز علمی و ادبی ہستیوں میں معروف افسانہ نگار شمیم اختر واقف کی چچا زاد بہن اور مرکز ادیب و شاعر اور نامور استاد پروفیسر اختر اورینوی کی چچا زاد بہنوئی تھے۔

شفقت پدری سے محرومی

واقف نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو مالی اعتبار سے بہار کا منفرد اور معزز گھرانا تھا؛ مگر اس قدر ظریفی دیکھئے کہ ان کی پیدائش کے ساتھ ہی چند نامساعد حالات نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے والد سید شاہ منظر امام کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ جب واقف اپنی والدہ صفیہ خاتون (متوفی ۳؍اپریل ۱۹۶۶ء) کے بطن میں تھے تو انہیں کسی نے زہر دے دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی تھی۔ بقول انوار محمد عظیم آبادی

> ''علامہ واقف کے والد محترم ان کی ولادت سے پہلے ہی مسموم ہو کر وفات پا چکے تھے''۔

(مدیر معاون: زبان و ادب، پٹنہ، مئی ۲۰۱۵ء، ص:۱۹)

جب کہ ''رازہائے درون پردہ'' کے مرتب سید کاشف امام کے مطابق

> ''جب ان کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ ان کے والد سید شاہ منظر امام صاحب پراسرار حالت میں دار فانی سے رخت سفر کر گئے''۔ (ص ۱۹)

سید شاہ منظر امام کی وفات کے سلسلے میں تضاد ہے، ان کی موت واقف کی پیدائش سے قبل ہوئی، یا بعد، یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ عہد طفلی میں ہی واقف شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ واقف کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جب وہ تین سال کے تھے تو عید کے دن کسی نے انہیں زہر دے دیا، جس نے رفتہ رفتہ اپنا اثر بھی دکھانا شروع کر دیا اور وہ بتدریج موت کی دہلیز کی جانب بڑھنے لگے۔ اتفاق سے انہی دنوں حکیم اجمل خاں طبی کانفرنس میں پٹنہ آئے ہوئے تھے، ان کی موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے سید شاہ محمد عمیر نے واقف کا معائنہ ان سے کرایا اور وہ حکیم صاحب کے زیر علاج رہے، یہاں تک کہ شفایاب ہوئے۔ صحت مندی کے بعد چار سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء میں ان کی والدہ انہیں لے کر ارہ سے اپنے میکے کراچی آ گئیں، جہاں انہوں نے محلہ چودھرانہ میں سکونت اختیار کی۔

رسم بسم اللہ، تعلیم اور رہن سہن

۱۹۲۰ء مطابق ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو چار سال چار ماہ کی عمر میں عین سحری کے وقت واقف کی رسم بسم اللہ حضرت امیر شریعت شمس العلماء مولانا سید شاہ بدر الدین پھلواروی نے کی۔ اس کے بعد ابتدائی تعلیم والدہ کی نگرانی میں اس حد تک ہوئی کہ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ مصنف نے ان کی پرورش و پرداخت بڑے اہتمام و خلوص کے ساتھ کی اور ان کے ذہن و فکر کی تعمیر میں بڑا کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ مدرسہ حنفیہ، پھلواری شریف میں ہوا، جہاں سے مولوی کی سند حاصل کی، جب کہ مدرسہ وحیدیہ آرا سے عالم کی سند لی اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے فضیلت کی سند پائی۔ دوران تعلیم ان کے ابتدائی اوقات جس شان سے گزرے اس کی تصویر تحفۃ عارف نے ان الفاظ میں پیش کی ہے

> "مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں واقف صاحب پٹنہ سے آنے کا کرایہ بچا کر [illegible] کی شیرینی، چوڑے مہنگی کا [illegible] اور [illegible] کھاتے آتے [illegible] کے [illegible] سے جیب [illegible] تھے، [illegible] جب تک آرا میں رہے [illegible] شریف [illegible] رہتے تھے۔"

(تحفۃ عارف، [illegible] ۹۹۱ء)

جب کہ ان کے ایامِ شباب کی بہاروں کا ذکر پروفیسر خواجہ افضل امام، سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی نے یوں کیا ہے:

"۳۵، ۳۶ کا زمانہ تھا، ہم کھگول ریلوے اسکول کے متعلم تھے اور اپنے چچا علامہ تمنا عمادی کے ساتھ پھلواری شریف میں رہتے تھے۔ ہم نے بارہا ابراہیم نجم ندوی، بہاء الدین فیض عظیم آبادی، ارمان آروی، پرویز شاہدی، اختر قادری، فضل امام واقف، شفیع پھلواری وغیرہ ہم و علامہ تمنا عمادی کے مکان موسوم بہ "دار ادب" پھلواری شریف میں کئی کئی دن قیام کرتے دیکھا ہے۔ تلامذۂ تمنا عمادی میں واقف صاحب کی ذات کو لحاظ سے نمایاں تھی۔ بہترین سرخ کی شیروانی، آنکھ پر سنہری فریم کا چشمہ، ہاتھ میں چاندی سے منڈھی چھڑی، پیر میں پینٹ پمپ کا شو، قیمتی کپڑے کا پائجامہ، سر پر ترکی ٹوپی، سیاہ خشخشی داڑھی، منہ میں پان، شیروانی کی جیب میں گھڑی، جس کی چین لٹکتی رہتی، جب غزل پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے جذبے ہوں

مثل یوسف کی جو تعریف کی فرمایا
مصنفی شعر ہے دیکھو اثر ایسی تو نہ تھی

(مضامین فضل، ص ۱۱۲)

رشتۂ ازدواج

۱۹۴۳ء میں واقف کی شادی سیدہ شاکرہ خاتون بنت ڈاکٹر سید عبد حمید، قاضی چک مسوڑھی، پٹنہ سے انجام پائی، جو ایک دیندار گھرانے کی نیک سیرت خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ راضی بہ رضا کے اصول پر تاعمر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس رشتہ سے انھیں ایک بیٹا (ابو امام کاشف) اور پانچ بیٹیوں سے نوازا۔

مہمان نوازی

واقف بذاتِ خود بہت شاہ خرچ، طبعاً انتہائی فیاض اور مزاجاً مہمان نواز تھے۔ ان کی یہ خوبیاں ان کی شاہی زندگی سے لے کر قلندری کے زمانے تک قائم رہیں۔ ان کا دل اور ہاتھ زندگی

بھر کشادہ رہا۔ ان کے دروازے یا ان کے پاس سے کوئی ضرورت مند کبھی واپس نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اپنی امیدوں اور ضرورتوں سے زیادہ ہی لے کر جاتا۔ کسی سائل کو کبھی ریزگاری نہیں دی۔ قدرتی آفات ہوں، یا ناگہانی واقعات، وہ ملی معاونت میں ہمیشہ سبقت لے جاتے۔ شعرائے کرام کی قدر دانی اور داد و دہش ان کی فطرت ثانیہ تھی، جب تک آرا میں رہے، کہیں بھی کوئی مشاعرہ ہوتا، شعرا ان کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ تمنا عمادی اور ان کے تلامذہ کا قیام واقف کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ بقول کامریڈ حبیب الرحمن

"بلا مبالغہ ان کے دسترخوان پر روزانہ سینکڑوں لوگ ہوتے تھے، جس کے وہ چشم دید گواہ ہیں"۔

(ایک شام واقف کے نام۔ ۲۲/۱۰/۸۸، خدا بخش لائبریری)

واقف کی دادیہال ہو یا ننھیال ہر جگہ دینی، ملی، شعری، ادبی سرگرمیاں ہمیشہ تیز سے تیز تر رہیں۔ ان کے خانوادے کے افراد قومی، سیاسی، سماجی نیز فلاحی و رفاہی کاموں میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وراثت میں واقف میں بھی منتقل ہوئیں، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں پھلواری شریف میں رونما متاثرین کی بازآبادکاری کے لیے انہوں نے اپنی جیب خاص سے ایک خطیر رقم عنایت کی تھی۔

تحریک آزادی میں حصہ

ہندوستان کی تحریک آزادی میں واقف کے خانوادے اور خود ان کی قربانیوں کی داستان جدوجہد آزادی سے عبارت ہیں۔ واقف بھی روپوش رہ کر گاندھی جی کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ آزادی وطن کے بعد انہوں نے کسی قسم کے وظیفے یا مراعات کی خواہش سے اجتناب کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ریاست بہار میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں انہوں نے اپنی حکمت عملی سے آرائے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد رکھنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا، چنانچہ شہر میں ہر طرف امن و امان اور خیر و کامل کی فضا برقرار رہی۔ دوسرے مقامات پر بھڑکنے والے فساد سے شہر کے لوگ بے حد مضطرب و پریشان رہتے تھے، لہذا

"۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر جب مسلم لیگ اور کانگریس کے بڑے بڑے لیڈران پٹنہ میں مقیم تھے، مسلم لیگ کے کارکن خواجہ ناظم الدین اور رفیق احمد

خاں کا قیام مسٹر یونس کے ساتھ گرینڈ ہوٹل میں تھا۔ کانگریس کے اکابر کچھ صداقت آشرم، کچھ ڈاک بنگلہ اور کچھ مختلف منسٹرز کی کوٹھیوں میں ٹھہرے تھے۔ خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی ڈاک بنگلہ میں قیام پذیر تھے۔ مولانا سید محمود صاحب منسٹر کے ساتھ اسی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے، جس میں آج کل گاندھی سنگرہالیہ کا دفتر ہے۔ جمعیۃ العلماء کا ایک وفد جس میں واقف صاحب، قاضی احمد حسین صاحب، حاجی عیسیٰ پھپھوروی، حاجی شفیع پھپھوروی شریک تھے، مولانا آزاد سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت مولانا آزاد اکابرین کانگریس یعنی راجندر پرساد، کرشن سنہا، انورہ نارائن سنگھ وغیرہ کے ساتھ کسی مشورے میں منہمک تھے۔ مولانا کی مشغولیت دیکھ کر ارکان جمعیۃ نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ واقف صاحب کہاں ماننے والے تھے، انہوں نے مولانا آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ حضرت! سورہ عبس و تولی کا شان نزول کیا ہے۔ مولانا آزاد اکابرین کانگریس کو چھوڑ کر واقف صاحب کی طرف مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے اور دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے اور اس دوران کانگریس کے اکابرین ان دونوں کی گفتگو سنتے رہے۔

(مضامین افضل، ص ۱۸)

ایک اعلیٰ سطحی قومی وفد کو فرقہ وارانہ فساد کے تعلق سے جمعیۃ العلماء ہند کی تشویش کو کم کرنے میں واقف نے جس ذکاوت و ذہانت کا ثبوت دیا وہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ مخاطب کو متوجہ کرنے کا یہی منفرد انداز آگے چل کر ان کے اشعار میں نمایاں ہونے لگا، جس سے انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔

نشیب و فراز

اس میں شک نہیں کہ مختلف مسائل سے دوچار ہوتے ہوئے بھی واقف نے شہزادوں جیسا بچپن اور رئیس زادوں جیسی جوانی گزاری۔ ایام طفلی سے عہد شباب تک چمن میں بہار باقی تھی اور اقبال مندی کا ستارہ عروج پر تھا۔ گھر کیا تھا ایک مہمان خانہ تھا، جہاں آئے دن شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں، آہ اور واہ کی گونج سن سن کر اساتذہ ہوں، یا شعراء، یا صاحب ذوق حضرات سب کشاں کشاں ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ایک مشاعرہ ختم بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے کی بساط بچھنے لگتی۔ ضیافت کا

حال یہ تھا کہ دستر خوان کو اٹھانے کی نوبت آتی، نہ حقے کی چلم ٹھنڈی ہو پاتیں ـــــ لیکن صبح آزادی کی پہلی کرن کے ساتھ واقف اپنے ہی اس شعر کے مصداق ہوگئے

یہ امنگیں، یہ ترنگیں، یہ گلوں سے چھیڑ چھاڑ
فصل گل آئی تو عالم ہی نرالا ہوگیا

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، ملک کی آزادی میں دوسرے محب وطن اور زمینداروں کی طرح واقف کے خاندان کی قربانیاں کسی دوسرے سے کم نہ تھیں، لیکن

"۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کو زمینداری کے خاتمے کے اعلان نے مسلم زمینداروں اور
کاشتکاروں کو بری طرح متاثر کیا۔ یہی تین برادری کے لوگ شعر و ادب سے شغف
رکھتے تھے، چنانچہ شعر و ادب کی دنیا قدرے سونی ہو کر رہ گئی"۔

("آرہ ایک شہر سخن" ص ۳۴)

چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جس پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

[illegible] مسلمان زمیندار خود کاشتکاری کا کام نہیں کرتے تھے۔ شعراء اور [illegible] اور [illegible] کے لئے میں اس قدر منہمک و مصروف تھے کہ اپنی رعیت، [illegible] جائداد، [illegible] جات، آمدنی، [illegible] جیسے اہم امور و دیوان اور [illegible] کی پرچھائیں [illegible] تھی، جس کا [illegible] نتیجہ ان کے اقتصادی و معاشی زوال کی شکل میں سامنے آیا۔ واقف نے اپنی بربادیوں کا پیش خیمہ بھی پہلے ہی بیان کیا ہے

"[illegible] شاعری سے [illegible] اور [illegible] نے [illegible] میں [illegible]
[illegible] میں [illegible] تھی، [illegible] کی تیاری میں [illegible] تھا [illegible] کی تشریف [illegible] اور [illegible]
[illegible] مال [illegible] کی تاریخ ۳۱ [illegible] اور [illegible] صرف [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] دیوان [illegible] آئے اور [illegible] آخری
تاریخ [illegible] صورت [illegible] ہو [illegible] واقعی [illegible]

یہاں خوشی اس بات کی تھی کہ غزل مکمل ہوئی۔ رہی جائداد تو اس کی واگزاری کے لیے مقدمہ بازی شروع کردی"۔

("لطف ستم" ص ۲۹-۲۸)

غربت کا آغاز

۱۹۴۷ء میں واقف کی عمر ۳۱ برس تھی۔ یہ سال جہاں ملک کے لیے ایک نیک فال تھا، وہیں ان کے زوال کا نقطۂ آغاز بھی تھا، جو ۱۹۵۲ء کے آتے آتے ان کی زندگی کے لیے ایک نئی عبارت لکھ گیا۔ ۱۹۶۶ء سے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی، یہاں تک کہ جو ہاتھ اشرفیاں اچھالتا تھا، وہ اپنے ہی اس شعر کی تضمین بن گیا

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
سونپ دیجے دیا کرتے ہیں پیمانہ مجھے

اور حالات یہاں تک پہنچے کہ

اشتہائی احباب ہوتی گرد، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
بھوکے ہوں تو یہ مطلب، جوئی کا نظر میں ٹھکانا کیا

واقف کے زوال کی شروعات ہونے لگی، جو بتدریج بڑھتی ہی گئی اور جسے خود انہوں نے اپنی "تدریجی غربت" اور "آہستہ خرام افلاس" سے تعبیر کیا ہے۔ ان وجوہات میں ایک طرف ان کی آمدنی کا محدود اور کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جانا ہے تو دوسری جانب ان کی شاہ خرچی، بے جا مہمان نوازی کے ساتھ مقدمہ بازی کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ اگرچہ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی تمام دولت و جائداد انہیں کے حصہ میں آئی، لیکن بے جا اسراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد ایک مکانات، دکانیں، کھیت کھلیان وغیرہ جائداد کے فروخت ہونے کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اول سے لے کر آخر تک کی ملکیت ہاتھ سے نکلتی گئی۔ انجام کار شاہانہ ٹھاٹھ باٹ اور شان و شوکت دیکھتے ہی دیکھتے خزاں رسیدہ ہو گئیں۔ ذیل کے اقتباس سے اس دردناک صورتحال کی عکاسی ہوتی ہے:

"زمینداری کے کاموں سے اعراض اور مشاعروں سے جنون کی حد تک وابستگی نے پورے گھر کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی۔ آہستہ آہستہ زر چہ کرغائب ہونے لگے اور

قیمتی چیزیں دے دی گئیں۔ علامہ کی والدہ حنیفہ خاتون ۱۹۶۶ء میں اس دارِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد محلہ چوہٹہ نے آرا کا وہ مکان جس میں علامہ کا عہدِ طفولیت اور شباب گزرا تھا فروخت ہو گیا۔ آرا سے منتقلی اور پٹنہ میں واقع محلہ کوکل پور میں سکونت اختیار کر لی گئی"۔

(زمانہ ماہ اپریل ۱۹۳۸ء ص ۲)

آرا سے پٹنہ مراجعت

واقف صرف چار سال کی عمر تک گیا روڈ میں رہنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ آرا چلے گئے۔ وہاں تقریباً پینتالیس سال کا عرصہ گزارتے گزارتے یہ سرزمین بھی ان پر اس حد تک تنگ ہونے لگی کہ انہیں والدہ کے انتقال کے بعد محل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ اسی سال وہ مع اہل و عیال کوکل پور پٹنہ میں اپنے برادر نسبتی عبدالسلام صاحب کے یہاں چلے گئے۔ چند دنوں تک وہاں قیام کے بعد پھلواری شریف میں قاری صاحب کے مکان میں کرایہ پر رہنے لگے۔ وہاں ڈیڑھ سال کا عرصہ بھی گزرا تھا کہ اہلیہ کو میت بال بچوں کے ساتھ واپس ہونے اور وہاں کسی محلہ میں ان کی رہائش کا بندوبست کرنے کی تمنا پٹنہ واپس ہوئے۔ جہاں ۱۹۹۳ء میں انتقال سے چند روز پہلے تک اس کے چراغوں سے اپنے خون جگر سے روشنی کرتے رہے۔ اور چھوٹے بڑے سب سے قدر دانوں اور عزیزوں کی محفل تھی۔ سید شاہ مشتاق احمد اور اختر اور یہی وہ ان کے قریب ترین رشتہ داروں میں سے تھے۔ خانوادہ خانقاہ منعمیہ فردوسیہ شاہ جانے پٹنہ سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔ مولانا رشید احمد ایڈوکیٹ (بعد وزیر) اور حکیم حسنین نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ علاوہ ازیں ادارہ شرعیہ سلطان خانقاہ مجیبیہ اور امارت شرعیہ پھلواری شریف ان کے حلقوں میں فعال رابطہ تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے دوستوں اور اخبارات سے وابستگی اپنے قیام سے زیادہ معزز و محترم سمجھی جاتی تھی۔ پٹنہ منتقلی سے قبل کئی سال قبل بھی ان کا رشتہ غیر منقسم ہندوستان کے صف اول کے رسائل و جرائد سے تھا جن میں "الہلال"، "ترجمان"، "مسلمان"، "الفقیہ"، "ریاست"، "انقلاب"، "زمانہ"، "ندا" وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کی وہ قلمی معاونت کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء کے بعد ان کا رشتہ روزنامہ "نقیب"، "صدائے عام"، "اخبار"، "قومی آواز"، "اتحاد وطن"، "ہفت روزہ آئینہ"، "پندرہ روزہ گلدستہ"، "ماہنامہ آئینہ"

"زبان و ادب" وغیرہ سے تادم مرگ جاری رہا۔ بعد کے دنوں میں حق الخدمت کی بنیاد پر خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ کے لیے بھی انہوں نے گرانقدر قلمی معاونت کی۔ آرا کو بستان عظیم آباد کی ہی توسیع سمجھنا چاہیے، جس کے نقوش واقف پر شروع سے ہی بڑے گہرے مرتب ہوئے تھے۔ خود وہاں کی شعری فضا کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب واقف کی عمر پندرہ سال ہوئی تو انہیں فرنگی محل لکھنؤ کے مذہبی، علمی و ادبی نیز سیاسی ماحول سے استفادہ کا بھی موقع ملا، جس نے ان کی ذہانت و ذکاوت کو جلا بخشنے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔

علمی استعداد

واقف بچپن سے ہی انتہائی ذہین تھے، مطالعہ کا ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہیں مختلف زبانوں اور علوم و فنون پر کمال درجہ کا دسترس حاصل تھا۔ اردو، فارسی اور عربی زبان و ادب پر غیر معمولی قدرت تھی ہی، انگریزی اور کسی حد تک ہندی زبان و ادب سے آشنا تھے۔ قرآن و حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ و مذاہب میں بھی پختگی اور واقفیت کی بنیاد پر ان کی شناوری تھی۔ تاریخ عالم پر بھی گہری نظر تھی۔ اپنے عہد کے مروجہ علوم میں فلسفہ، منطق، قواعد، عروض، علم جفر و رمل، نجوم، ہیئت، ہیئت اور حکمت کے علاوہ عمرانیات، سیاسیات اور مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تھا۔ موسیقی سے شغف ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کی باریکیوں پر بھی گہری نظر تھی۔ مذہبی مخطوطات پر ان کی ذاتی لائبریری میں چھ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں، جن کی فہرست سازی جناب شمس عارف ماہر آروی نے کی تھی۔ ان کی ذہانت قابل داد اور حافظہ قابل رشک تھا۔ حاضر دماغی و بذلہ سنجی میں یکتائے روزگار تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک شخص میں اتنی ساری خوبیوں کا بیک وقت جمع ہو جانا خوبیٔ خالق سے ممکن نہیں۔ شاعری میں اپنے وقت کے ممتاز استاد شاعر، حضرت تمنا عمادی پھلواروی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ بحیثیت شاعر خود وسیماب، اصغر، جگر اور اقبال کی صفوں میں شمار کرتے تھے۔ اس وقت کے زمیندارانہ مزاج اور شان کے مطابق فن سپہ گری، خنجر سواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کا فن بھی اپنے عہد کے ماہرین سے سیکھا۔

عہد ماضی تو میرا بھولا ہوا افسانہ تھا

تغیرات زمانہ کے ساتھ واقف کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے عبارت تھی، چنانچہ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے شاندار ماضی کو بھی ذہن نشین رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جہاں زمیندارانہ

ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ شاہی طرز زندگی کی ساری آسائشیں موجود تھیں، وہیں جوانی کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی یہ قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ زمانہ نے کروٹ بدلی تو نہ وہ تہذیب رہی نہ مذاق رہا اور نہ وہ معیار و اقدار، یہاں تک کہ سیاست، معیشت و معاشرت میں بھی زمین و آسمان کا فرق آ چکا تھا۔ جس کی ضربیں بھی ان پر پڑیں مگر ان حالات میں بھی ان کی خودداری اپنی جگہ قائم رہی، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

کو اپنا شیوۂ حیات اور زندگی کے اصول بنایا تھا اور انہیں پر ان کی زندگی آخری وقت تک گامزن رہی۔ مگر اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شخصیت اجتماع ضدین بن کر رہ گئی۔ ایک طرف بے حد خوش مزاجی تو دوسری جانب مزاج میں بلا کی گرمی، کبھی بے حد غضبناک اور جوش و جذبات میں آپے سے باہر تو کبھی بے مثال معصومیت و انکساری، کبھی نہایت حلیمانہ و فیاضانہ گفتگو تو کبھی مغلظات اور گالیوں کی ایسی بوچھار کہ پوری نعت مرتب ہو جائے، کبھی خوش لباسی کے ساتھ بال بنانے سے نہایت قرینے سے بنے ہوئے تو کبھی پڑے سے نامہ پر بے ڈھال شیروانی، بے ہیئت ٹوپی اور پاؤں میں چپل جیسی کوئی چیز، بہتیرا وہ اچھا قلم ان کے پاس ضرور رہتا۔ کبھی حالت میں انواع و اقسام کی چیزیں تو کبھی کوٹے کی راتب حاضر پیٹ کی آگ بجھاتے۔ کبھی فصاحت و بلاغت کا دریا بہتا تو کبھی ان پر خاموشی کے پہرے ہوتے۔

واقف کی شخصیت کی تشکیل میں جن عوامل کی کارفرمائی تھی، ان میں ان کی بذلہ سنجی سے ساتھ ظرافت و مزاح اور ظرافت کو بڑا دخل تھا۔ اسی وجہ سے ایک زمانہ تک وہ اپنے شاندار ماضی کی یاد کو بھلاتے رہے اور حالات سے خوف سے دور رہے۔ اسی نے انہیں طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی دیا اور حالات پر غلبہ پانے کا عزم بھی بخشا۔ اسی کے ساتھ ان کا خدا داد حافظہ، بلا کی ذہانت اور شگفتہ تحریریں، نیز فی البدیہہ اشعار ان کے رفیق و جلیس رہے۔ ان کی زندگی میں نہ جانے کتنے طوفان آئے مگر انہوں نے کبھی غیر کا سہارا نہیں لیا۔ خوشامد، چاپلوسی اور مصلحت جیسی چیزیں بھی ان کا راستہ نہیں روک سکیں۔ جن امور نے انہیں متاثر یا ردعمل کے طور پر وہ ان کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنے۔ اپنے زمانہ میں حالات حاضرہ پر اتنی بے باکی اور جرأت مندی سے شاید ہی کسی شاعر نے تیشہ چلایا ہو کا جتنا واقف نے۔ یہاں کہ واقف کا ضمیر زندہ تھا۔

واقف کی دانشوری کا ایک زمانہ قائل ہے اور بلا شبہ ایسے نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بظاہر کبھی کھوئے کھوئے، دنیا سے بیگانہ دکھائی دینے والے واقف کا ذہن ہر وقت بیدار رہتا تھا۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے فصاحت و بلاغت ہی نہیں علم کا دریا بہا دیتے۔ وہ علم کی ایک ایسی مشین تھے جو چند سکوں کے عوض کسی اخبار کے لیے "واقف آرٹ" یا "شذرات واقف" کے تحت خون جگر اگلتے تو اسی وقت کسی روزنامہ کے لیے اداریہ بھی سپرد قلم کرتے۔ کسی کے لیے معمولی حق الخدمت پر ریڈیو ٹاک لکھتے تو کوئی سہرا اور رخصتی نامہ لکھوا کر لے جاتا اور کسی کی حمد و نعت کی فرمائش پوری ہوتی۔

اگر کسی کو کسی سے رنجش کا کوئی، یا انتقام لینا ہوتا، وہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے ان سے رجوع کرتا۔ واقف کی نوک قلم سے بڑی بڑی ہستیوں کے بخل ہونے کا تماشہ لوگوں نے تقریباً پچاسوں سال تک اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

واقف کی خداداد صلاحیتوں کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کسی موضوع پر لکھتے ہوئے وہ اپنی تحریروں کو اشعار اور نثر کی حوالوں سے مزین کرتے تھے اور پوری صحت کے ساتھ کتاب کے اقتباس، اس کا صفحہ، سن اشاعت اور مطبع تک کا نام درج کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر انہوں نے اس زمانے میں لکھے، جب ان کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی اور برسوں سے کتاب پڑھنے کا انہیں موقع نہیں ملا تھا۔ ان کے ذہن میں علمی مضامین کے حوالوں میں وہ رسائل و جرائد بھی قابل ذکر ہیں، جن کا تقریباً سارا مواد ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ کسی اخبار کا دفتر، لائبریری، یا ان کا کوئی اور مستقر ہو، بیٹھتے رہنا اور لکھتے رہنا۔ دن کے اوقات میں یہ چیزیں ان کی معمولات زندگی کا حصہ تھیں، مگر رات کے اپنے شباب پر آتے ہی ان پر ایک عجیب و غریب اضطرابی، بلکہ وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ وقت صرف ان کے لیے مخصوص تھا، اپنے رب سے سرگوشی کا، نالۂ نیم شبی کا۔ ان کی پیچیدہ سطر سے کم ہی ملتی تھی۔ وہ ٹہلتے رہتے، گنگناتے رہتے، کبھی آیات الٰہی کبھی اور اوراد و وظائف، کبھی حمد و نعت و سلام تو کبھی گریہ، یہاں تک کہ اذان فجر ہو جاتی۔ ان کی اس کیفیت کا مشاہدہ واقف کے اس میزبان نے کیا ہوگا، جس کے نصیب میں ان کی شب گزاری کی سعادت آئی ہوگی۔

واقف کا قیام ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۳ء تک پٹنہ میں رہا، البتہ انتقال سے کچھ دن پہلے بیمار ہو کر کاکو چلے گئے، پھر وہاں سے پٹنہ آئے۔ وصال سے صرف دو دن قبل وہ آرا چلے گئے جہاں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ جس عظیم آباد کو انہوں نے اپنے نام کا جزو لاینفک بنائے رکھا اور جس شہر میں ان کی ناقدری

COPYT, URDU LIBRARY PATNA

ہوئی وہیں ان کی قدر و منزلت میں بھی اہل شہر نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور ان کے مزاج کی تمام ناہمواریوں کے باوجود انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے رہے۔ یہاں تک کہ جن اکابرین اور ذی اقتدار شخصیتوں کو انہوں نے اپنے قلم کا نشانہ بنایا، وہ بھی ان کی خیر خواہی کا دم بھرتے رہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، ناظم امارت شرعیہ حضرت مولانا نظام الدین، ادارہ شرعیہ پھلواری شریف و دیگر عہدیدین امارت کے علاوہ خانقاہ منعمیہ قمریہ کے سجادگان، خواجہ افضل امام (جن کے اپنے چھوٹے تمنا عمادی کے واقف شاگرد تھے)، شاہ مشتاق احمد، عامر سرور، ہارون رشید وغیرہ ان کی میزبانی و دلجوئی میں پیش پیش رہتے تھے۔ بہار کے دو گورنر یونس سلیم اور ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی بطور خاص ان کی دانشوری کے معترف اور قدردانوں میں تھے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سابق ڈائرکٹر خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ ان کی علمی حیثیتوں کے معترف تھے۔ ان کی قدردانی ہی کا نتیجہ تھا کہ گزشتہ نصف صدی کے زائد عرصے سے واقف کے دل و دماغ میں جو مذہبی، تاریخی، سیاسی نیز علمی، ادبی، ثقافتی سرمایہ محفوظ تھا اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں انہیں کامیابی ملی۔ ''یادگارات واقف'' کے نام سے بارہ جلدوں پر مشتمل قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اس لائبریری میں منعقدہ واقف کے اعزاز میں ''ایک شام واقف کے نام'' منعقدہ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۸۸ء، عابد رضا بیدار کے فیہ معمولی پذیرائی کا مظہر ہے لیکن بقول حفیظ بنارسی یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے۔

کام وہ نوک قلم سے لیتا تھا شمشیر کا
اک زمانہ آج تک گھائل ہے اس کے تیر کا

خواجہ افضل امام کے مطابق:

> ''واقف صاحب کے قلم سے ارکان امارت شرعیہ بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ خاص کر رحمت اللہ رحمانی مرحوم، امیر امارت شرعیہ پھلواری شریف۔ اختلاف یہ تھا کہ جب ناظم امارت شرعیہ مولانا سید نظام الدین صاحب کو واقف صاحب سے عمل و خیال کی فاقہ کشی کا حال معلوم ہوا تو ان کی خانگی کی صورت نکال دی، جب سے نہیں (واقف صاحب) امارت شرعیہ سے تعاون کا حال معلوم ہوا تو بہت شرمندگی محسوس کی، چنانچہ ایک سے زیادہ مرتبہ حضرت رحمانی سے تعاون پر بیعت ہوا اور مرثیہ واقف نے لکھا تھا۔''
>
> (مضامین افضل ص ۱۱۵)

واقف اور روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کے رشتوں کا ایک زمانہ شاہد ہے۔ انہوں نے اس اخبار کی ادارت بھی کی، اسی روزنامہ میں ان کی سب سے زیادہ تخلیقات بھی شائع ہوئیں۔ نہ جانے ان کی زندگی کے کتنے شب و روز دفتر ''سنگم'' لالہ زار منزل، سبزی باغ، پٹنہ میں گزرے۔ شہر و بیرون شہر کی کیسی کیسی ہستیاں یہاں ان کی قدم بوسی کو پہنچتیں، کتنے لوگ ان سے سہرا، رخصتی نامہ، تہنیتی نظمیں، تاریخ وفیات وغیرہ لکھواتے، بے شمار ریسرچ اسکالرس نے یہیں سے واقف سے تحقیقی مواد حاصل کیا اور نہ جانے کتنے ان کی فیاضی سے شاعر بن گئے۔ بقول واقف

رہے ہم تو اپنا نہیں کوئی دعویٰ
ہیں موجود 'سنگم' کے سارے شمارے

گویا روزنامہ ''سنگم'' واقف کی رہائش گاہوں میں ایک رہائش گاہ تھی۔ یہی اخبار ان کے احساس و جذبات کا ترجمان اور سامان زیست تھا، جس کے خلاف زندگی بھر جو چاہا، بلا روک ٹوک لکھا۔ جب عملاً وہ ''سنگم'' کی ادارت سے دستبردار ہو گئے تو اسی اخبار میں ''واقف آرٹ'' کے نام سے اپنا کالم شروع کر دیا۔ کسی کو انہیں روکنے ٹوکنے کی ہمت نہ تھی، کیوں کہ کوئی کچھ رہے، انہیں یہ احساس تھا کہ ''میں سید شاہ فضل امام واقف ہوں''۔ یہی احساس ان کی قوت تھی، جس نے انہیں پوری مضبوطی سے قائم رکھا تھا اور غلام سرور کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ

''پچاس سالہ پیک ادب میں جتنی گالیاں سنیں، ان میں علامہ واقف کی گالیاں آدھی ہیں۔ واقف مرحوم نے کہا تھا جب میں آپ کو گالیاں دیتا ہوں تو اس کے عوض لوگ مجھے پیسہ دیتے ہیں، جب میں دوسروں کو گالیاں دیتا ہوں تو 'سنگم' مجھے پیسہ دیتا ہے۔ دراصل ان گالیوں میں علامہ کے لیے رزق کا سامان تھا''۔

(''آبشار'' کلکتہ، ۶ر اکتوبر ۲۰۰۶ء)

عابد رضا بیدار کے زمانہ میں جب واقف کا خدا بخش لائبریری آنا جانا رہا، بیدار صاحب کی ان پر خاص نظر رہی۔ لائبریری اسٹاف کو ہدایت تھی کہ وہ جہاں چاہیں بیٹھیں اور جن کتابوں سے استفادہ چاہیں انہیں فراہم کی جائیں۔ لائبریری کینٹین جو وہاں کے اسٹاف اور ریسرچ اسکالرز کے لیے مخصوص تھا واقف صاحب کو بھی اس سے استفادے کی سہولت حاصل تھی۔ انہیں دنوں وہ حق الخدمت کی بنیاد پر

"گلزارِ شاتِ واقف" کی تحریر و تصنیف میں مشغول تھے۔ ان کی فرمائش پر معاوضہ میں انھیں سے نوٹ اور نئے سکے دیئے جاتے تھے لیکن وہ بیدار صاحب کے بھی شاکی تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے مجھ سے کہا

"جانتے ہو میرے بھائی میرے شہ آرا کا ایک جاہل محرر بھی تھا۔ اس کی حاضری کے لئے کافی صفحہ اس روپے لیتا ہے اور ایک بے درد ہے۔ نئے ہم اور جنگل تھا وہ دیتے ہیں وہ مجھے تین روپیہ لیتا ہے تو میں بھی یہ کر رہا ہوں بھائی ایک صفحہ میں آٹھ سطر ہی دے رہا ہوں وہ سمجھتا ہے میں لوٹ رہا ہوں جب کہ میں سے لوٹ رہا ہوں۔"

واقف نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہو:

میں واقف لوگ میرے دل کی قیمت کیا سمجھیں گے
ارزانی میں بھی اغلب گراں ہونا نہیں آتا

واقف کا [illegible] یہ [illegible] نہیں [illegible] اپنے [illegible] کرنے میں [illegible] نہ رہتے۔ جس [illegible] میدان [illegible] مزاجی کے ساتھ بے قراری اور بے [illegible] کی [illegible] تھی [illegible] جلدی [illegible] نہیں [illegible] تھے۔ یہاں تک [illegible] اپنے [illegible] پشت در پشت [illegible] تک [illegible] نہیں [illegible] تھی [illegible] منفعت [illegible] کی [illegible] تھا [illegible] ان [illegible] پیش [illegible] تھے۔ ایک [illegible] تھی [illegible] موجودہ [illegible] کی [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] تھا [illegible] تھا [illegible] کے [illegible] ان [illegible] کی [illegible] کے ساتھ [illegible] اس [illegible] کی [illegible] کی [illegible] اجرت [illegible] رہے [illegible] اپنے [illegible] تھے [illegible] تھے [illegible] رہے تھے [illegible] ان [illegible] پر [illegible] تھے [illegible] واقف [illegible] تھا [illegible] تصویر [illegible] نے [illegible] کی ہے

"[illegible] میں [illegible] تھے [illegible] تھے [illegible] تھے [illegible] میں [illegible] تھے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] واقف [illegible]

(۳۲ [illegible])

حسرت دیدن کا ایک اور نقش سید جاوید حسن نے اس طرح پیش کیا ہے:

''جن لوگوں نے علامہ کو آخری وقتوں میں قریب سے دیکھا ہے، وہ ان کی مزید چند خصوصیات کا اضافہ کرلیں گے، مثلاً سر پر، رسمی طور پر ٹوپی، ہونٹوں میں اکثر باہیڑی سگریٹ، جسم پر صاف کم، بیشتر میلا سا کرتا پاجامہ، پیروں میں ہوائی چپل، شانوں سے لٹکتا ہوا جھولا، جھولے میں دو چار نئے پرانے قلم، چند مڑے تڑے سادے، یا خود کے تحریر کردہ کاغذات اور ہاتھ میں چھڑی اور ہاں جھولے، یا کرتے کی جیب میں راکھ، علامہ راکھ کیوں کھاتے تھے؟ یہ ایک معمہ ہے، کہیں وہ پیٹ کی بھوک راکھ بھر کر ہی نہیں بجھا لیتے تھے''؟

(لطف سخن، ص ۱۹)

وہ پتھر کوئلے کی راکھ کی قاشیں ہونٹوں سے پیسے دے کر خریدتے تھے، جو اب معشوق کی طرح ان سے تقریباً پچیس تیس سال تک لگی رہی۔ نہ جانے کیوں؟

واقف کا آخری سفر

وہ ہے قبر سخن واقف کی اس پر فاتحہ پڑھ لے

جہاں اردو کی چنگاری چراغاں کرتی جاتی ہے

۱۹۹۳ء کی بات ہے، واقف عظیم آبادی اپنی عمر کا آخری حصہ پروفیسر خواجہ افضل امام صاحب کے یہاں گذارنا چاہتے تھے۔ چند دن وہاں قیام کے بعد فتاوہ منعمہ، پٹن گھاٹ چلے آئے، پھر وہاں سے کہیں اور نکل گئے۔ بے قراری انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی رہی۔ اسی درمیان ایک دن اچانک خواجہ صاحب کے یہاں پہنچے۔ بہت ضعیف، ناتواں ہو چکے تھے۔ بصارت بھی جواب دے چکی تھی۔ فرمانے لگے:

''خواجہ صاحب! میں اپنی زندگی کی شام آپ ہی کے مکان پر گزارنا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ بسر و چشم۔ واقف صاحب ہمارے والد کے ہم نام تو تھے ہی دونوں میں یارانہ بھی تھا، لہٰذا واقف صاحب کے ساتھ سلوک و خدمت ہم کار ثواب سمجھ کر کرتے تھے''۔

(مضامین افضل، ص ۱۲۰)

یہاں قیام کو چند دن ہی گزرے تھے کہ ان کے فرزند آجہ امام کاشف انہیں اپنی سسرال بی بی پور، کاکو لے گئے۔ کچھ دن وہاں رہنے کے بعد عابد رضا بیدار سے ملنے پٹنہ آئے۔ اس درمیان کچھ خواجہ صاحب کے یہاں ہی ٹھہرے۔ پہلے سے زیادہ ناتواں و کمزور ہو چکے تھے۔ اعضا بھی مضمحل ہو گئے تھے۔ زندگی بھر جس کی خودداری نے کسی سہارے کو گوارا نہیں کیا، اب اسے روز بدلنے کے لیے بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ یہاں چند روز قیام کے بعد ان کے صاحبزادے انہیں بی بی پور لے گئے۔ ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ آجہ امام کاشف انہیں دفتر ادارہ شرعیہ، سلطان گنج، پٹنہ لے آئے اور وہیں سے آرا کا قصد کیا۔ کسی طرح ایک رات گزری۔ دوسرے دن صبح ان کی روانگی ہونی تھی۔ کسی سواری سے جانے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے ایمبولینس کا انتظام کر دیا۔ واقف کی روانگی کا وقت تھا۔ ایک بار انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے عظیم آباد اور اہل عظیم آباد کو دیکھا۔ وہ بھی چھلک رہے تھے اور انہیں وداع کرنے والوں کو بھی ان سے بچھڑنے کا احساس ہو چکا تھا۔ اس وقت خواجہ فضل امام صاحب ان کے بالکل قریب تھے، جنہوں نے ان کی جدائی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عمر بھر ساتھ یہی دے گا بڑھاپا اپنا

واقف صاحب کے [illegible] کی خوش رہنے [illegible]

کا کچھ سنایئے، چنانچہ ایک قطعہ انہیں سنایا

سب کو زمانے کا ستم بیٹھے ہیں
کھانے کو احباب کا غم بیٹھے ہیں
[illegible] بیٹھے ہوئے تھے
سب اٹھ گئے اور ایک ہم بیٹھے ہیں

[illegible]

افسوس ایک ایسا باغ و بہار شخص جو زندگی بھر کبھی چین سے نہیں بیٹھا۔ ایمبولینس میں بے بس پڑا تھا، اس کے ہاتھ سے راکھ کی پوٹلی اور کاغذ کی تھیلی پہلے ہی چھوٹ چکی تھی۔ قلم کاتب تقدیر کے حوالے کر بیٹھا تھا۔ رہے بس نام اللہ کا۔ اسے اٹھنے کا احساس ہو چکا تھا۔ 'ہم بھی اٹھنے والے ہیں'۔ خودداری نے آخر اظہار مدعا بھی کر دیا۔ 'دعاؤں میں یاد رکھیے گا'۔

۵ ستمبر ۱۹۹۳ء کی صبح ایمبولینس واقف کو پٹنہ سے لے کر آرا کی طرف چل پڑی۔ شام ڈھلنے سے پہلے سید شاہ نسیم الحق، گولہ محلہ، آرا کے یہاں پہنچے۔ وہاں صرف ایک رات گزار کر ۶ ستمبر ۱۹۹۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) دوسرے دن ۷ ستمبر بعد نماز عصر اپنے ننیہالی قبرستان، منشی پانڈے کا باغ، آرا میں آسودۂ خاک ہوئے

لحد میں یہ فرشتوں نے کہا واقف مبارک ہو
کہ تم کلمہ سے جنت کی فضا لیتے ہوئے آئے

واقف: ایک درویش

واقف ایک صوفی تھے، ولی تھے، درویش تھے، قلندر تھے، بوریا نشیں فقیر تھے، قطب تھے، ابدال تھے، یہ مذہب ہوتے تھے، یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب صاحب ہیں۔ ان کی شخصیت اس قدر پہلو دار تھی کہ ان کی روشنائی ان کی زندگی میں بھی ممکن نہ ہو سکی۔ یہاں تک وہ اپنے لیے ہوئے اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے جد امجد شاہ محمد ولی پیر انہوں نے یہ نسبت بھی لکھی ہے جس میں ان سے اپنی نسبت ظاہر کی ہے۔ وہ پیر ان پیر حضرت عبدالقادر جیلانی ہیں جن کا جد امجد تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کا جناب

کرم واقف پہ ہے جد کریم شاہ جیلاں کا
سمجھتے ہیں مگر یاروں کی نادانی نہیں جاتی

انہیں صوفی خانوادوں کا فیض ہمیشہ حاصل رہا۔ ان کی رسم بسم اللہ پیر طریقت شمس العلماء [illegible] سید شاہ بدرالدین پھلواروی کے ذریعہ عمل میں آئی۔ [illegible] سال کے عمر میں حضرت قاضی [illegible] پھلواروی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے جب [illegible] سید شاہ امان اللہ قادری [illegible] پھلواری شریف پٹنہ سے انہیں شرف بیعت حاصل ہوا۔ خانقاہ منعمیہ فردوسیہ پھلواری شریف پٹنہ سے عقیدت اور قرابت داری تھی۔ تصوف سے ان کے شوق کا یہ حال تھا کہ سلسلہ قادریہ کے قوم بیعت تھے ہی دیگر سلاسل سے بھی انہیں گہری عقیدت تھی۔ اپنی ذہانی ناتوانی کے باوجود ۱۹۸۳ء میں خواجہ

اجمیری کی درگاہ پر حاضری دی اور وہیں ایک عقیدت مندانہ منقبت "دربارِ خواجہ میں" کہی۔ لیکن ان کے باطن کی دنیا کیا تھی، یہ وہ جانتے ہوں گے، یا ان کا خدا۔ البتہ ان کی ظاہری کیفیت کو دیکھتے ہوئے رضوان اللہ آروی نے "علامہ واقف ایک پراسرار شخصیت" کے عنوان سے ایک مضمون پر قلم کیا، جس میں انہوں نے ان کی شخصیت کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی کی کوشش کی ہے اور بعض حقائق کی جانب متوجہ بھی کیا ہے، جو اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ جاتے ہیں

"کہتے ہیں کہ تصوف سے بھی ان کا ربط تھا اور انہوں نے سلسلۂ طریقت میں بیعت بھی کی تھی، لیکن مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تصوف کی کون سی راہ پر گامزن تھے، البتہ میں نے انہیں پنج وقتہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ صوفیانہ وظائف نظر آئے۔ ہاں اتنا ضرور دیکھا کہ وہ جو کل دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، جب ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک پڑھا جاتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو جاتے۔ [illegible] کا ہیں خاص سے اتر کر زمین میں [illegible] تھے۔ تصوف کی وہ [illegible] کی مثال تھی، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ علامہ واقف صوفی تھے، یا نہیں [illegible] مشکل ہے، لیکن وہ [illegible] رہتے [illegible] چھوٹنے [illegible] بعد بھی یوں مطمئن نہ ہوتے۔ یہ [illegible] رہتا [illegible] ان کی [illegible] پر چھائیں بھی نہ تھی، یہ [illegible] رہتا کہ وہ [illegible] تھے۔"

([illegible] ۱۹۹۲ء [illegible])

واقف کی شخصیت کے حوالے سے ان کے وہ شعر بھی بہت چونکاتے ہیں، جو انہوں نے عین عالم جوانی میں کہے تھے:

چراغ کشتۂ بزم محبت ہوں میں اے واقف
فروزاں عمر بھر رہنا ہے مجھ کو سوزشِ دل سے

کام آئیں ہر جگہ زیست کی ناکامیاں
ہر قدم پر رہنما بنتی گئی مشکل مجھے

واقف نے خوشحالی کا وہ ایک چھوٹے سے شہر آرا میں گزارا۔ جب وہاں کی سرزمین ان پر تنگ ہوئی تو وہ پٹنہ چلے آئے، جسے شروع سے مرکزیت حاصل رہی۔ میرٹھ کی پے در پے حملوں نے برباد کیا

اور انہوں نے لکھنؤ کا رخ کیا تو [illegible] نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دو سو روپے اور بعض تذکرے کے مطابق تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ یہاں انہوں نے مورنامہ، دریائے مرغ بازاں، دریائے ہولی، شکار نامہ جیسی نظمیں لکھیں۔ آرائش، واقف و مشاعرہ نے بڑا کیا تو وہ پٹنہ میں گزر بسر کے مواقع ڈھونڈنے لگے اور اس اخبار سے اپنی قسمت وابستہ کی جو ہمیشہ سرکاری عتاب کا شکار ہوتا رہا۔ ایڈیٹر روزنامہ "مسلم" پٹنہ عامر سرور بھی جیل میں تو کبھی جلاوطنی میں۔ ان پر حکومت مخالف رویے کے الزامات میں بے شمار مقدمات چل رہے تھے اور عامر سرور چھ بار جیل جا چکے تھے۔ واقف کی جب جوانی کی خودداری اور انا نے انہیں بڑھنے سے روکا۔ شاید اسی نفسیات نے انہیں واقف آروی سے سید شاہ محمد فضل امام واقف آروی ثم عظیم آبادی بنا دیا۔ ان کے احساس نفس، تعین ذات اور تحفظ شخصیت کے لیے ان کی زندگی کے آخری دن تک یہاں کے نام کا ایک اضافہ حصہ بن رہا تھا۔ ایک صرف نواب شاہ محسن آروی کے چشم و چراغ کی ان کی بھی رہے اور معروف پھلواری خاندان کی عزت پر بھی حرف نہ آنے پائے۔

واقف کے یہاں فقیرانہ صورت، توکل، قناعت، استغنا، وسیع مشربی، انسان دوستی، درد مندی، ملنساری، وجہ ملال، ان کے کلام میں پائی جانے والی شیرینی و حلاوت دراصل ان کی تصوف پسندی کی [illegible] ہے۔ [illegible] ان کی بے نیازی اور قلندری نے مزید [illegible] ان کے سامنے دست سوال دراز [illegible] ان کی [illegible] کے [illegible] ان کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ [illegible] ان کا [illegible] ان کی [illegible] رہا۔ توکل علی اللہ کے [illegible] جنہوں نے اپنی زندگی [illegible] زیادہ [illegible] ان کے [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] ——— [illegible] ان کی زندگی [illegible] زندگی کے [illegible] میں پچیس تیس برس تک اپنے ساتھ [illegible] رہے۔ [illegible] ان کے ساتھ [illegible] ان کی آنکھوں میں [illegible] ان کی آنکھوں میں [illegible] ان کی [illegible] ان کی [illegible] ان کی

"کوئی فقیر علامہ واقف کے سامنے ہاتھ پھیلائے، یہ ناممکن کہ وہ خالی ہاتھ واپس چلا جائے، خاص کر پہلا فقیر۔ ایک بار اخبار کے دفتر سے نہیں دس روپے ملے، جیسے ہی باہر آئے، ایک فقیر نے ہاتھ پھیلا دیا، انہوں نے جیب سے دس روپے نکالے اور فقیر سے کہا کہ یہی دس روپے ملے ہیں، آدھا تمہارا آدھا ہمارا، اور انہوں نے پانچ روپے فقیر کو دے دیے اور کہا جب تک میری جیب میں پیسہ ہے میں پیسے کی توہین نہیں کروں گا۔"

ویسے بھی وہ جس رکشے کی سواری کرتے، اجرت کے علاوہ بھی اسے بخشش ضرور دیتے، جس ہوٹل میں کھانا کھاتے، یا اشیائے خورد و نوش لیتے، قیمت کے ساتھ بیرے کو بھی کچھ عنایت کرتے۔ خواجہ افضل امام نے ایک رکشہ والے سے ان کے سلوک کا ایک دلچسپ واقعہ رقم کیا ہے

"نہ بت خانوں میں نام اس کا نہ کعبہ میں نشاں اس کا
بتاؤ جنس الفت ظالمو! آخر کہاں رکھ دی

اب اس شعر کی توضیح کے لیے موصوف رکشہ پر ہمارے یہاں تشریف لائے، رکشہ سے اترے، کرایہ ادا کیا، چند قدم چلے، پھر رکشہ پر سوار ہوئے، رکشہ والے کو راستہ بتلاتے جاتے، منزل تک پہنچے اور فرماں خراماں واپس چلے آئے۔ اب اس واقعہ کو قاری اپنے ذوق کے مطابق جنس الفت کی تلاش پر محمول کرے، یا ان کے جذبۂ خلوص پر۔"

(مضامین فضل، ص ۱۱)

تو یہ تھے واقف کی پراسرار شخصیت کے چند مزید پہلو۔ ان کے بارے میں ایک عام مشاہدہ یہ بھی تھا کہ وہ بڑے شیلے پیلے رہتے تھے، غسل کا اہتمام بہ تکلف کبھی کرتے ہوں گے، پھر بھی ان کے جسم سے کبھی بو نہیں، بلکہ ایک خاص قسم کی خوشبو آتی تھی، جس کی طرف ایڈیٹر "سخن" نے بھی مجھے کئی بار متوجہ کیا تھا، اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کریں، گرچہ انہوں نے اپنے تزئین کلام کو بھی نشاط غم سے مرصع کیا ہے، لیکن ان میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جو ان کی شخصیت کا آئینہ دکھاتے ہیں اور ہمیں ان کے اندرون میں جھانکنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں

یہ آبگینہ دل وقف ضرب پیہم ہے
نفس کی آمد و شد زندگی کا ماتم ہے
ستم ظریف ہے کتنا جمال فطرت بھی
بہار خندہ گل ، فیض اشک شبنم ہے

جواب نغمہ چنگ و رباب ہے واقف
شکست دل کی جو آواز آج مدھم ہے

وہ ہمیشہ ایک بات کو بہت زور دے کر کہا کرتے تھے

''میری پہلی وفاداری خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے''۔

شاید اسی احساس نے ان سے یہ شعر بھی کہلایا:

پیام عمل ہے یہی ہر ولی کا
عبادت خدا کی ، اطاعت نبیؐ کی

واقف کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں نے ان کی زندگی کے بعض ایسے مخفی پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن سے ان کی ''پراسرار شخصیت'' کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

''۱۹۷۵ء میں جب وہ (واقف) ان (پروفیسر مرتاض الدین، داناپور) کے مکان پر تشریف فرما تھے [illegible] سیلاب سے محفوظ تھے [illegible] پروفیسر صاحب پس و پیش میں پڑے رہے۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پٹنہ میں [illegible] سیلاب بھی آ سکتا ہے۔ تین یک ہفتہ کے بعد پٹنہ میں سیلاب کا پانی پہنچا [illegible] پروفیسر صاحب کے [illegible] چاروں طرف زیر آب ہو گئیں، پانی کمروں میں داخل ہونے لگا [illegible] اور انہوں نے دعا پڑھنی شروع کی [illegible] پانی [illegible]''

(مقالات نوازش ڈاکٹر مظاہر الحق ص ۸۲-۸۳)

ان کی ایک بات جو رہ رہ کر مجھے یاد آتی ہے:

''۱۹۷۰ء [illegible]

بادشاہت پر غور کر رہا ہوں"۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سا جواب تھا لیکن دنیا نے دیکھا کہ قدرت کو بھی یہی منظور تھا۔ میرے ذاتی مشاہدے میں ایسے اور بھی کئی واقعات آئے ہیں"۔

عبدالغفور صاحب ۷۵-۱۹۷۳ء میں بہار کے وزیر اعلیٰ تھے، وہ واقف صاحب کے عقیدت مندوں میں تھے۔ اکثر و بیشتر ان سے سوک کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔ دسمبر کی کسی تاریخ کو ایک دن واقف صاحب ان سے ملنے ان کی سرکاری رہائش گاہ پہنچے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ "واقف آرٹ" جو ان دنوں کانگریس کے گلے پر چھری کی طرح چل رہی تھی، اس کا بھی ذکر نکلا۔ غفور صاحب ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بات کرتے کرتے رات ہوگئی۔ ان کی دیسی پر وزیر اعلیٰ نے انہیں دو قیمتی کمبل کا تحفہ پیش کیا، جس کے وزن کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ والے آدمی نے کمبلوں کو سنبھال کر رکھ لیا۔ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ انہیں "سنگم" کے دفتر آنا تھا۔ وزیر اعلیٰ کی کوٹھی سے دو ڈھائی میل کی مسافت طے کی ہوگی کہ راستے میں نہیں دو فقیر نظر آئے، جو سردیوں سے ٹھٹھرے فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔ واقف صاحب کی نظریں ان پر جا پڑیں۔ انہوں نے دونوں فقیروں کے جسموں پر ایک ایک کمبل ڈال دیا اور آگے کی راہ لی۔ ان کے ساتھی کو ان کے اس عمل پر حیرت بھی ہوئی اور جھنجھلاہٹ بھی "یہ آپ نے کیا؟ کون سی عقلمندی ہوئی؟" واقف صاحب نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا "انہیں سردی نہیں لگے گی، مجھے لگ جائے گی۔" ابھی دفتر "سنگم" پہنچے بھی نہیں تھے کہ ایک دوسرے صاحب نے انہیں ایک نئی بے مثال عنایت کر دی۔ بیشک رزاق پر ان کا بھروسہ بڑھ گیا۔ یہ بات جناب واقف نے

فقیری میں فقیروں کی تو اصل کون رہتا ہے
یہ درویشی نظر آئے کی جنت میں جوں ہوں

حضرت ذوالنون مصری نے صوفی کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے

"صوفی وہ ہے جسے تجوتہ نہ ہو اور محرومی سے بے چین نہ کرے"۔

اس طرح علی بن عثمان ہجویری "کشف المحجوب" میں کہتے ہیں

"صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی بحق ہو جائے اور اپنے مزاج اور طبیعت کی قید سے آزادی حاصل کر کے رضی برضا ہو جائے"۔

واقف کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تصوف کی مندرجہ بالا تعریف کو مختصر رکھیں تو پھر ان کی شخصیت کے اسرار خود بخود کھل جاتے ہیں۔

آرا کا شعری پس منظر

عہد قدیم سے ہی ہندوستان میں آرا تہذیبی، تمدنی، نیز تاریخی و سیاسی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تقریباً چار سو سال سے یہ شہر علم و ادب اور شعر و سخن کا ایک عظیم الشان مرکز رہا ہے۔ اس کی نشوونما میں یہاں کی خانقاہی روایت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ آرا میں اردو شاعری کی ابتدا شاہ عالم ثانی کے عہد سے ہوتی ہے۔ یہاں سے سمت مغرب تقریباً تیس کیلومیٹر دور کے فاصلے پر "مراسے بنارس" نامی بستی میں ایک بزرگ شاہ مدار قادری اپنے مریدوں کو رشد و ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مریدوں میں مرزا عبدالخالق اور ان کے بھائی مرزا قلندر بھی تھے، جو اپنے شیخ کے یہاں رہ کر ان کی خدمت پر مامور تھے۔ ۱۹۳۶ء میں عبدالخالق کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا۔ اس نے آنکھ کھولی تو دنیا کے حسن میں مرزا عبدالقادر بیدل کے نام سے شہرت حاصل کی۔ عبدالخالق کے انتقال کے بعد بیدل نے ہی عبدالقادر کی پرورش و پرداخت کی۔ قیاس اغلب ہے کہ ۲۹ سال کی عمر میں ۱۷۶۴ء میں تلاش معاش میں وہ دہلی پہنچے، جہاں محمد اعظم شاہ خلف اورنگ زیب کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ انہیں شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔ میر تقی میر نے "نکات الشعرا" میں ان کا یہ شعر درج کیا ہے

شہرۂ حسن سے از بس کہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

ان کی مکمل غزل اردو تذکروں کی دو ہزار کتابوں میں موجود ہے۔ بیدل وارفتگی مانتے ہوئے

آرا میں اردو شاعری کی ابتدا ۱۶۴۶ء کے آس پاس ہوتی ہے، مگر ان کی جائے پیدائش متنازعہ ہے۔ اگر بیدل آروی نہ بھی ہوں تو ان کی وفات کے برسوں بعد میر سید خورشید علی خورشید بلگرامی ۶ ستمبر ۱۷۴۶ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے، اس اعتبار سے خورشید بلگرامی کو ہی آرا میں شاعری کا نقطۂ آغاز سمجھا جائے تو یہی عہد میر و سودا کا بھی تھا۔ خورشید بلگرامی کے معاصرین میں آرا میں لالہ جگرناتھ سنگھ مخدوم جیسے قادر الکلام شاعر بھی تھے، جن کی مثنوی "قصہ است نور" اس عہد کی اردو زبان کا نمونہ ہے۔

قدیم صوبہ بہار (بشمول بنگال، آسام اور اڑیسہ) میں صوبیداری تھی، جو بنگال کے ماتحت تھی۔ فرخ سیر کے زمانہ میں یہاں نظامت قائم ہوئی، جس کی باگ ڈور نواب علی وردی خاں کے ہاتھوں تھی، جسے انہوں نے زین العابدین خان بیت جنگ کے سپرد کر دیا، جو ان کے داماد اور بھتیجا تھے۔ اس زمانہ میں بیت جنگ کے ہم زلف ہدایت علی خان فوج کے بخشی ہوئے اور لالہ جانکی رام نائب صوبیدار عظیم آباد مامور ہوئے۔ وہ امور سلطنت کی انجام دہی کے ساتھ شعر و سخن میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ لالہ جانکی رام کے بعد راجہ رام نرائن موزوں نائب صوبیدار ہوئے، جن کا مشہور شعر آج بھی زبان زد عام ہے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ایک زمانہ تک مختلف تاریخی و سیاسی نشیب و فراز سے گزرتا ہوا ۱۹۴۱ء تک ریاست بہار کا شاہ آباد قائم رہا، پھر یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، روہتاس کا صدر مقام سہسرام اور بھوجپور آرا ہوا۔ یہ پہلے بھی شاہ آباد کا صدر مقام تھا۔ سہسرام کو زمانہ قدیم سے شعر و سخن کی آماجگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور آج بھی یہاں شعر و ادب کی ترقی و ترویج جاری ہے۔ خواجہ میر درد کے دیوان کی اولین اشاعت مطبع کبیریہ، سہسرام سے ہی ہوئی تھی۔ آرا کے اس عہد زریں میں مسلمانوں کے علاوہ آرہ اور کاستھ گھرانوں کی بھی شعری و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آرا کو یہ بھی امتیاز رہا کہ یہاں صغیر بلگرامی، سریر کابری، بدر آروی، طبیب آروی، تمنا عمادی، ثاقب عظیم آبادی، شمس عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، وحشت کلکتوی کے علاوہ نوح ناروی کے شاگرد تو تھے ہی راسخ، غالب، مصحفی، شمشاد اور سیماب کے تلامذہ بھی شعر و سخن میں پیش پیش تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے کیسے نامور اساتذۂ سخن کے دم سے آرا کی ادبی محفل آباد تھی اور مذکورہ اساتذہ کے شاگرد بھی یہاں ماہ و انجم کی طرح چمک رہے تھے۔

غدر (۱۸۵۷ء) کے زمانہ سے آرا میں شعری و ادبی انجمنوں کی تشکیل اور شعرا کے کلام کے

گلدستوں کی اشاعت کی سند بھی ملتی ہے۔ جس سے وہاں سخن شناسی اور سخنوری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی کی شاعری آرا میں ہوئی اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں کا ادبی و شعری احوال انہوں نے ''داستان سخن'' میں لکھا ہے۔ یہ غالباً ۱۸۶۰ء کی تصنیف ہے۔ انہوں نے ''انجمن احباب'' کے نام سے ایک بزم بھی قائم کی تھی۔ صفیر بلگرامی، افضل آروی، باقر آروی، حکیم قمان حیدر، سلیم آروی، منشی بانک رام، منشی سیرت نارائن شاکر، منشی رگھوویر دیال وغیرہ انجمن کے ماہانہ مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ آرا میں مشاعروں کی روایت کو فروغ دینے والوں میں امیر حسن بدر آروی (۱۹۳۰ء/۱۸۷۵ء) کی غیر معمولی خدمات ہیں۔ اس زمانہ میں انہوں نے بڑے پیمانے پر مشاعرے بھی کرائے۔ یہاں تک کہ آرہ کی گلی گلی، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں سخن وری کا شہرہ ہو گیا اور شاید ہی کوئی ایسا گھر بچا ہو جہاں شاعر نہ ہو۔ بدر آروی کے معاصرین میں وجد آروی، قیس آروی، منشی اسرار بہاری، بال اصغر، منشی رگھونندن نسبت، محفی آروی، نند شاد جوہر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں وہاں محمد احسن مارہروی، رضا علی وحشت کلکتوی، عشرت لکھنوی، نوح ناروی اور بیدم حیدرآبادی جیسے شاعروں کی بھی آمد ہوتی تھی۔ بدر آروی نے ایک سدا رنگین مشاعرہ کلب بنا رکھا تھا، جس سے اس کی شہرت نامی خوبی یہ تھی کہ وہ منظوم تھا اور اسی میں طرحی مصرعہ بھی تھا

مرجھا گیا ہو، پاے قاتل پہ جھکی تلوار ہو

ساحل دہلوی، احسن مارہروی، محفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، بیدم حیدرآبادی، نوح ناروی جیسے شاعروں نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ مشاعرے میں نوح ناروی سے اس قطعہ کی فرمائش ہوتی تھی اور اس حوالے سے بھی آرا کی شہرت رہی

کہتے ہیں کہ پیارے مرے پیارے آئے — تھی لیے دریا سے نارے آئے

اللہ رے تشنگی حضرت بدر — نارے سے چلے نوح تو آرے آئے

اس مشاعرے کے محرک سید حامد حسین حامد، سجادہ نشین درگاہ شاہ ارماں، پٹنہ تھے، جو خود بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ آرا کی شاعری و پروان چڑھانے میں ولی حیدر آروی ابن صفیہ بدر آروی تلمیذ بدر آروی سے علاوہ مختلف انجمنوں، شعری گلدستوں اور طرحی مشاعروں کی روایات نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں ''بزم احباب'' کی بنیاد ڈالی، جس کے تحت پابندی سے ماہانہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ اس میں بدر سے شاگردوں میں نطق، وجد، قیس، قمر وغیرہ طرحی غزلوں کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوتے

تھے۔ "شاہ آباد اردو لائبریری" آرا کے سالانہ جلسے کے طرحی مشاعرے کی شہرت آرا سے باہر بھی تھی۔ اس مشاعرے میں شکر پال فتنہ، علی حیدر گہر، حمید مرزا پوری، میر آروی، نصرت آروی، قمر کھتاری، جوہر نظامی اور عبدالفضل ادیب واقف جیسے قدر اکابر شعرا پابندی سے شریک ہوتے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ اسی زمانے میں "ادارۂ ادب" آرا جس کا نام بعد میں "دارالفنون ادب" آرا ہو گیا، جس کی سرپرستی نصرت آروی فرماتے تھے۔ "تحفۂ ادب" شاہ آباد آرا اسی لائبریری کے طرحی مشاعروں کا گلدستہ ہے۔ "دارالفنون ادب" آرا کا ہفتہ وار مشاعرہ ہوتا تھا جو عید، دیوالی اور دوسرے تہواروں پر ہونے والے مشاعروں کے لیے بھی یہ مشہور تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۶۰ء تک نیر آروی کی سرپرستی میں ایک شعری انجمن فعال رہی۔ آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں شمس معارف ماہر آروی نے "ہوردو ادب" کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک "بزم تحافت" بھی کافی سرگرم رہی۔ سید شاہ فضل امام واقف آروی کا دولت کدہ واقع محلہ چوہٹہ بھی ایک زمانہ تک شعر و سخن کی آماجگاہ رہا۔ ان کے یہاں منعقدہ مشاعروں کی صدارت عام طور پر ان کے استاد حضرت تمنا عمادی پھلواروی فرماتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں واقف کے یہاں منعقدہ ایک یادگار طرحی مشاعرہ میں معز الدین جاوید کا یہ شعر سر چڑھ کر جادو کی طرح بول رہا تھا

ہر گل اندام چڑھ جاتا ہے وہ پھول سر پر
قبر عشاق کی گل پوش ہوئی جاتی ہے

واقف کی غیر مطبوعہ تحریروں میں، جو "کارشات واقف" کے نام سے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں، ان میں ایسے دیگر مشاعروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کے وہ مشاعرے بھی کافی مقبول ہوئے جو دوسرے مقامات پر منعقد کیے گئے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے چودھری محمد اکرام الدین حباب کی نشست کا وہ جو "جلسہ" کہا گیا تھا، وہاں تمنا عمادی کی صدارت میں ایک مشاعرہ برپا تھا، جس کی طرح تھی۔

وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

حباب پہلے حالی کے شاگرد تھے۔ بعد میں انہوں نے قیس آروی سے مشورۂ سخن لیا۔ واقف آروی کے معاصرین میں نور نوحی، ارمان آروی، راحت رحمن بہاری، حسرت، عباس بلگرامی، مظہر بلگرامی، باقر حسین، چودھری محبوب عالم، چودھری مجیب رضا، حسنین اشک، ماہ منیر خاں سہسرامی، نور الدین پیکر، حبیب آروی، محمد کلیم، حکیم سہسرامی وغیرہ کی گونج نہ صرف آرا بلکہ پورے بہار میں سنائی دے رہی تھی، آج بھی ان کے ذکر کے بغیر بہار میں اردو شاعری کا کوئی تذکرہ نگاہ اعتبار حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

واقف بحیثیت شاعر

(الف) غزل گوئی

شعر و سخن سید شاہ فضل امام واقف کا خاندانی اور موروثی ترکہ تھا ہی قدرت نے بھی انہیں ذہن رسا اور موزونی طبع کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں کی طبیعت سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اس وقت آرا میں کیا ہندو؟ کیا مسلمان؟ ہر طرف شعر و شاعری اور مشاعروں کا دور دورہ تھا۔ بقول واقف

"میری رندی کا آغاز شاعری سے ماحول میں سہ اور قدیم آرٹ شاعری سے لیے مشہور تھا۔ آج جدید آرٹ کا مرکز پٹنہ ہے، عظیم آباد ہے، اس کا رنگ ہی الگ ہے، ورنہ ہمارے یہاں قدیم سے شعر تھے۔ ان شاعروں پر پنی بانڈی کی فکر نہیں تھی، فکر تھی یہ آج سے شاعر سے کی غزل تیکی ہوں۔ یہاں کا قافیہ کیسے ملا جائے گا۔ ہوں کسی آدمی کا شاعر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، شاعر نہ ہونا تعجب کی بات تھی تو یہ ماحول تھا۔ ریت بازی کی مجلسیں ہوں مرکز میں ہوتی تھیں، ان میں کا سنجیدہ ہوتی تھی شریک ہوتے تھے اور ریت بازی سے لیے ہمارے ہوں وہ ضرور ہوتے تھے اور یہ سارے باتیں مل کر مجھے شاعر بنا رہی تھیں۔ اگر میں نے اب تک کوئی شعر نہیں کہا تھا تو اتفاقی طور پر ایک خصوصی نے بڑی وسیع ملاقات کی نے جوابی مصرعہ یاد رہیں نے ... شعر کہا

اگر بکرا مارے گا بکری کو سینگ
تو بکری بھی مارے گی بکرے کو سینگ

یہ میرا پہلا شعر تھا''۔

(ایک شام وقف کے نام، خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۸ء)

اس وقت واقف کی عمر کیا رہی ہوگی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن سولہ سال کی عمر سے ہی انہوں نے اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرانے شروع کر دیے تھے، اس کے علاوہ اپنے احباب اور بزرگوں کے یہاں بھی شعری محفلوں کا انعقاد کراتے تھے۔ ۱۸ سال کے ہوتے ہوتے ان کے کلام نے بڑے بڑے اساتذۂ سخن کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۳۰ر اگست ۱۹۳۴ء کو واقف کے دولت کدہ پر منعقد ایک مشاعرہ کی صدارت ان کے استاد حضرت تمنا عمادی پھلواری نے کی تھی جس میں واقف نے جب یہ اشعار پڑھے:

زمانے سے انھی ہے رسم وراہ منزل الفت
کہ بڑھتا ہی گیا بعد مسافت قطع منزل سے
چراغ کشتہ بزم محبت ہوں میں اے واقف
فروزاں عمر بھر رہنا ہے مجھ کو سوزش دل سے

تو ہر طرف واہ واہ تحسین کی بارش ہونے لگی اور استاد نے بھی جب اپنے نئے نویلے شاگرد کی اٹھان دیکھی تو دم بخود رہ گئے۔ ۷ر مارچ ۱۹۳۶ء کو سید شاہ حسیب الحق ناشاد آروی کے مکان واقع ملکی محلہ کے ایک طرحی مشاعرہ میں واقف کی غزل اساتذۂ سخن سے خراج تحسین لیے بغیر نہ رہ سکی۔ دوسرے دن شرکائے مشاعرہ کی زبان پر ان کا یہ شعر بطور خاص تھا

یہ امنگیں، یہ ترنگیں، یہ گلوں سے چھیڑ چھاڑ
فصل گل آئی تو عالم ہی نرالا ہوگیا

اس کے بعد تو ان کے کلام کی بازگشت آرا سے نکل کر پورے بہار میں کی جانے لگی اور وہ بھی پابندیوں کے ساتھ ولی حیدر گہر آروی ابن صفیہ بلگرامی کی ''بزم ادب'' کے ماہانہ مشاعروں اور ''حلقہ احباب'' آرا کی طرحی نشستوں میں شامل ہونے لگے۔ اس دور کی غزلوں میں ان کی عمر اور ان کے کلام کا تیور ملاحظہ فرمائیں:

جب نہ رکھا ضبط الفت نے کسی قابل مجھے
دیکھیے طعنوں پہ طعنے دے رہا ہے دل مجھے
کام آئیں ہر جگہ پہ زیست کی ناکامیاں
ہر قدم پر رہنما بنتی گئیں مشکل مجھے

ہر نماز شوق کا انداز بے باکانہ تھا
ہائے کعبہ میں بھی دخل لغزش مستانہ تھا
تو نے پھر تڑپا دیا اے مستی ابر بہار
عہد ماضی تو مرا بھولا ہوا افسانہ تھا
اشک حسرت، چشم پرنم، یاس و حرماں، درد و غم
سینکڑوں عنواں تھے لیکن ایک ہی افسانہ تھا

اے دل بے ضمیر سن نالۂ نیم شب مرا
سارے جہان خواب کا بار گراں اٹھائے کیوں
محفل دور جام سے وعدہ صبح و شام تک
جو انہیں آزما چکا پھر انہیں آزمائے کیوں
واقف زندہ دل یہاں چوک ذرا سی ہوگئی
[illegible]

سوز الفت کا زمانہ ہے چھپانا کیسا
شمع جب بزم میں آئی تو فروزاں آئی
یہ آبگینۂ دل وقف ضرب پیہم ہے
نفس کی آمد و شد زندگی کا ماتم ہے
یہ [illegible] لیے صبح انقلاب آئی
چراغ [illegible] کی روشنی [illegible] ہے

ستم ظریف ہے کتنا جمال فطرت بھی
بہار خندۂ گل ، فیض اشک شبنم ہے
جواب نغمہ چنگ و رباب ہے واقف
شکست دل کی جو آواز آج مدھم ہے

زندگی جب ہوچکی شمع مزار آرزو
کچھ چراغ کشتۂ محفل نہیں ہوتی کبھی

نہ بت خانہ میں نام اس کا نہ کعبہ میں نشاں اس کا
بتاؤ جنس الفت ظالمو ، آخر کہاں رکھ دی

غزلوں کے یہ اشعار تقریباً ۱۹۶۵ء تک کی یادگار ہیں، جو اپنی تمام تر رعنائی، دلکشی اور فنی مہارت کے ساتھ کلاسیکی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں رنگ تغزل بھی ہے اور جمالیاتی کیف بھی، سوز و گداز بھی ہے اور لذت غم سے آشنائی کا حوصلہ بھی۔ واقف کا حزن و یاس قنوطی نہیں رجائی ہے اور یہی سچا حزن ہے، جو کسی شاعر کو بڑا نہیں عظیم بناتا ہے۔ واقف کی نت نئی تراکیب اور الفاظ کی پیکر تراشی نے انہیں سخنوری کی ایک نئی آواز بنا کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کے اشعار کے استعارے، تلمیحات و تشبیہات ایک ایسی امیجری بناتے ہیں، جو بیک نظر ذہن قاری کو اصل موضوع سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کی یہی خوبیاں ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہیں اور انہیں اپنے معاصرین میں منفرد و ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ انہوں نے فرسودہ مضامین بھی باندھے ہیں، لیکن ان میں بھی ان کی انفرادیت موجود ہے۔ وہ غزل کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کے رمز شناس تھے۔ انہوں نے عارفانہ غزلیں بھی کہیں اور صوفیانہ بھی۔ بعض غزلوں میں رومانی کیف و کم بھی ہے، اگرچہ وہ خالص کلاسیکی مزاج رکھتے تھے، مگر غزل میں ہونے والے نت نئے تجربات، اس کے مطالبات و امکانات سے اچھی طرح باخبر تھے، لہٰذا غزل کی ہیئت سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر انہوں نے ندرت و جدت سے کام لیتے ہوئے، ان تمام موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھال دیا، جس کی وہ متحمل ہوسکتی تھی۔ غزل کے چہرے کو نکھارنے اور سنوارنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

دوسرا دور

ستر کی دہائی سے واقف کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دہائی کے آتے آتے ان کی غزلیں عصری حسیت کی خوبصورت ترجمان بن گئیں۔ ان غزلوں کا رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ اب قدرے مختلف ہو چکا تھا، جو دور سے پہچانا جانے لگا تھا اور وہ تخلیقی اظہار کے شاعر بن کر افق شاعری پر نمودار ہونے لگے، جس نے فرد و سماج کے باہمی ارتباط کی تصویر کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حیات و کائنات کے بے شمار موضوعات و مسائل ان کی غزلوں کے دامن میں جگہ پانے لگے، جس کا اظہار انہوں نے اپنی بعض غزلوں اور متفرق اشعار میں جا بجا کیا ہے

ہر اک برنگ ٹاپک پر لکھا مرے سوا کس نے
جو لکھا وہ بہ رنگ آتش صحرا لکھا میں نے
زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی
مزہ آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے
شگفتہ طبع ہوں ہر رنگ ہے باغ و بہار اپنا
ہر اک مضمون خار و گل تر و تازہ لکھا میں نے
مرے اشعار میں ہے بلبل شیراز کا نغمہ
بہت رنگیں لکھا لیکن بہت سادہ لکھا میں نے

چنانچہ حالات نے جب کروٹ بدلی تو واقف کی زندگی میں بھی انقلاب آیا اور ان کی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بلبل شیراز کے نغموں کے ساتھ وہ سیاسیات بھی بن گئے اور اس کے لیے انہوں نے خاص مزاج اور لہجہ اختیار کیا۔ بیان کے مزاج سے اس قدر تم آہنگ ہو گئے کہ ۹۰ کے بعد ان کی تمام تر شاعری اسی محور کے ارد گرد گھومنے لگی۔ البتہ انہوں نے کبھی اقدار و معیار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ایک غزل کے چند اشعار حوالے کے طور پر درج ہیں

رہے سکون دل بے دعا رہے نہ رہے
ہے ذوق سجدہ ترا نقش پا رہے نہ رہے

رواں ہے کشتی امید و بیم کیا کہنا
خدا کا فضل تو ہے ناخدا رہے نہ رہے

لیکن اس غزل کے آخری تین اشعار ان کے مخصوص مزاج کا آئینہ ہے، جس رُخ پر بعد میں ان کی پوری شاعری چل پڑی:

مری غزل میں ہے پٹنہ بھی اور دہلی بھی
کسی کا نام کسی کا پتہ رہے نہ رہے
نگاہِ یار میں اسکینڈل کے آنسو ہیں
کسی کی آنکھ میں شرم وحیا رہے نہ رہے
جناب نوح بھی کیا خوب کہہ گئے واقف
کہ تم رہو نہ رہو یہ مزہ رہے نہ رہے

واقف کی غزلوں کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں، ان میں فکر کا تنوع، موضوعات کی ہمہ گیری اور مخصوص مزاج کی جلوہ ریزی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے مذہبی، ملی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی، معاشرتی، انسانی ـــــ غرض حالات حاضرہ کے گوناگوں مسائل پر اپنے سنجیدہ اور مزاحیہ کلام سے اردو غزل کے دامن کو مالا مال کیا۔ انہوں نے قرآنی آیات، تاریخی واقعات، نادر تلمیحات، استعارات، بے مثل تشبیہات اور حسب موقع ضرب امثال کا استعمال تو کیا ہی، انگریزی اور ہندی کے الفاظ سے بھی اپنے کلام کو پُر لطف بنایا، جو ان کے سماجی تصورات و اظہار میں بڑے موثر ثابت ہوئے۔ شاید ان کی اسی انفرادیت نے ان سے اس قسم کے اشعار کہلوائے

کیف اندر کیف ہے یا لطف اندر لطف ہے
آپ پڑھیے! لذت اشعار بڑھتی جائے گی

یہ جائزہ، یہ تجزیہ، یہ ہسٹری، یہ مسٹری
مرے قلم کی نوک پر جو آگیا نہ پوچھئے

افسوس کہ ان کے ابتدائی دور کے غزلیہ کلام کا بیشتر حصہ جو ان کا اصل رنگ سخن ہے، اب ناپید ہے، جو کچھ مشاعروں کے کلدستوں میں، کچھ ادھر اُدھر اخبار و رسائل میں اور کچھ ان کی زبان

سے سننے والوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے، وہی دستیاب ہے۔ ایک اور ستم یہ ہوا کہ انہوں نے اپنا مجموعہ کلام "فرمودہ" کے نام سے مرتب کیا تھا اور جس پر بہار اردو اکادمی نے اشاعتی امداد بھی دی، اس کی کتابت بھی ہوئی، اس کے ابتدائی سولہ صفحات چھپ بھی گئے تھے، جسے داخل دفتر کرنے کے بعد رقم کا چیک بھی ملا، لیکن اس کی اشاعت مکمل کیوں نہیں ہوئی؟ یہ ایک معمہ بھی ہے اور المیہ بھی، اب تو مسودہ کا بھی کہیں سراغ نہیں ملتا۔ لے دے کر ان کی چند غزلیں میرے پاس تھیں، جو انہوں نے مجھے "صاحب کتاب" یا "شاعر" بنانے کے لیے دی تھیں، ان کی وہ امانت میرے پاس محفوظ ہے، جنہیں میں نے نام منسوب کرتے ہوئے اپنی کتاب "تلاش، تصنیف" میں شامل ایک مضمون کا حصہ بنا چکا ہوں۔ نمونتاً چند غزلیں ملاحظہ ہوں

داستانِ غم دل مجھ سے سنائی نہ گئی
آہ! وہ بات جو لب تک کبھی لائی نہ گئی

اب رقیبوں سے بھی ناراض نظر آتے ہیں وہ
بات بے چاروں کی بگڑی تو بنائی نہ گئی

غیر کے در پہ تو سو بار گیا ہوں لیکن
غیر کے در پہ جبیں اپنی جھکائی نہ گئی

دل برا ان کا نہیں لاکھ برے ہوں عشاق
زاہدو! تم سے مگر دل کی برائی نہ گئی

میری ہستی کو مٹایا تو مٹایا لیکن
میری تصویرِ خودی تم سے مٹائی نہ گئی

[illegible] فطرت کی قسم شانِ مشیت کی قسم
طبعِ عشاق کبھی راہ پہ لائی نہ گئی

کیا درِ حسن پہ روزانہ صدا دیتے ہیں
ان کے عشاق کی یہ شانِ گدائی نہ گئی

[illegible]
جو نہ ہنستے ہوں ہنسی ان کی اڑائی نہ گئی

جو تری نیم نگاہی پہ فدا ہو کے رہا
ساری دنیا سے خفا سب سے جدا ہو کے رہا
اہل دل ہو کے رہا اہل صفا ہو کے رہا
جو تری راہ میں نقش کف پا ہو کے رہا
ہم اگر بیٹھے تو کونین کا دل بیٹھ گیا
جب اٹھے ہم پھر اک حشر بپا ہو کے رہا
سر بریدہ ہوئی دنیائے محبت لیکن
رفتہ رفتہ بت سفاک خدا ہو کے رہا
وہ اسے کرتے گئے خاک چمن میں پنہاں
خون عشاق مگر رنگ حنا ہو کے رہا
شیخ سمجھا نہ مجھے واعظ ناداں سمجھا
دردِ عصیاں ہی مرے دل کی دوا ہو کے رہا
مثل آئینہ اگر منہ پہ کہا صاف کبھی
اپنے احباب کی محفل میں برا ہو کے رہا
اس گلستاں میں رہا اپنی روش پر میں نسیم
بادِ صرصر نہ رہا موج صبا ہو کے رہا

مقام عشق میں ہر رہ گزر سے کام نہیں
ہیں تیرے در پہ کسی سنگ در سے کام نہیں
ملی یہ کہہ کے مناجات پیر میخانہ
دعا سے کام ہے لیکن اثر سے کام نہیں
رفوئے چاک گریباں کریں گے خار چمن
دل حزیں کو کسی بخیہ گر سے کام نہیں

ہوئی ہے شمع بھی گریاں بہ خاک پروانہ
جلا غریب مگر شور و شر سے کام نہیں
جنوں ہے اور بیاباں میں ہے مقام نسیم
کھلی فضا ہے مجھے بام و در سے کام نہیں

اگر بغور دیکھا جائے تو واقف کے طنزیہ مزاحیہ کلام ہی نہیں ان کی نعت، سلام، منقبت وغیرہ میں بھی رنگ تغزل کی کمی نہیں ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

(ب) نظم نگاری

واقف بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن نظم گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عام موضوعات کے علاوہ انہوں نے بڑی تعداد میں نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، نوحہ، تہنیتی نظمیں، تاریخ ہائے وفات اور رباعیات، قطعات بھی کہیں۔ روحانیات سے متعلق بھی ان کا بڑا خاص کلام موجود ہے، جو وجد، عرفان اور علم و آگہی کا نمونہ ہے۔ تصوف کے حوالے سے بھی ان کا کلام اثر و تاثیر رکھتا ہے اور خاص معنویت و غنیت کا حامل ہے۔ انہوں نے تصوف کے حقیقی معنی و مفہوم اور اصطلاحات کی اپنے اشعار میں بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر اس ذیل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

پڑھو صلِ علیٰ جب گفتگو میں ان کا نام آئے
نہ جانے یہ عمل کس وقت کس مشکل میں کام آئے
خدا کا حکم ہے جب امت خیر الانام آئے
نبیؐ پر بھیج کر میرے درود آئے، سلام آئے
خدا سے ایذی قومی کہہ دیا سرکار نے فوراً
فرشتے ارض طائف میں جو بہر انتقام آئے
ہوں ابراہیم و موسیٰ، نوح و آدم کوئی پیغمبر
شہ والا ان کی ہر لغزش منزل میں کام آئے
نبیؐ کی شان میں ارشاد ہے یہ حق تعالیٰ کا
ہمارا عشق دیتے ہیں جو لے کر ان کا نام آئے

مری ہر صبح روشن ہے، مری ہر شام رنگیں ہے
کہ لے کر رحمت عالمؐ، یہ دورِ صبح و شام آئے
بہت فیاض ہیں میخانہ طیبہ کے متوالے
کہیں ساغر بکف پہنچے، کہیں آتش بہ جام آئے
کیا انکار جس نے سجدۂ تعظیم آدم سے
عبادت اس کے کام آئی نہ سجدے اس کے کام آئے
سبق حاصل کرو تم! قصۂ ابلیس و آدم سے
کہیں بیٹھے نہ رہ جانا اگر وقت قیام آئے

واقف نے حضرت فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے ان دو نعتیہ اشعار کی جو بدیع المثال تضمین لکھی ہے، وہ بھی داد طلب ہے

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
فیض ہے یا شہ تسنیم نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا

اب تضمین ملاحظہ ہو

قہر میں آتا ہے جب رب تعالیٰ تیرا
کانپ کر عرش بھی لیتا ہے سہارا تیرا
سب سے ہے دست عطا دہر میں اونچا تیرا
واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
عالم غیب و شہادت میں ہے چرچا تیرا
سب کو دیتا ہے ترے ہاتھ سے مولیٰ تیرا
تو وہ داتا ہے کہ ثانی نہیں دیکھا تیرا
فیض ہے یا شہ تسنیم نرالا تیرا

آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا
نام لیتے ہوئے آتے ہیں مسیحا تیرا
زندگی بخش دو عالم ہے وسیلہ تیرا
کیوں نہ بیمار زمانہ میں ہو اچھا تیرا
فیض ہے یا 'شہ تسنیم' نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا

اس سے علاوہ ایک سلام بحضور سید الشہداء علیہ السلام بھی ملاحظہ کریں

تمام عمر تماشائے چشم تر دیکھا
عجیب لطف شہنشاہِ بحر و بر دیکھا
علیؑ کو قوت بازوئے مصطفیؐ سمجھا
نبیؐ کو اپنے غلاموں سے باخبر دیکھا
ملا حسینؑ سا آقا گنہگاروں کو
دماغ امت مرحوم عرش پر دیکھا
اذاں پکاری جو اکبرؑ نے صبح عاشورہ
حُرِ جری نے بھی اندازۂ سحر دیکھا
حضور تشنہ لبی میں وہ پیاسا مثال معین نہ
نہ سوئے تخت نظر کی نہ مال و زر دیکھا
یہ پوچھتا تھا لعینوں سے جوش نہر فرات
جلال چہرۂ عباسؑ نامور دیکھا؟
بہت طویل ہے یہ داستاں کہ اصغرؑ نے
رُخ حسینؑ بھی القصہ مختصر دیکھا
[illegible] مرض [illegible] شفا حق سے ملی ہے واقف
یہ [illegible] [illegible] میں اثر دیکھا

واصف عظیم آبادی

سوار دوش ناز سید خیر الوریٰؐ تم ہو
صراط مستقیم نقش پائے مصطفیٰؐ تم ہو
لکھی قرآن کی تفسیر جس نے خون سے اپنے
سنا میں نے وہ تم ہو، اے شہید کربلا تم ہو
ہو تم سردار جنت یہ رسول اللہؐ کہتے ہیں
خطائے اہل دوزخ تھی نہ سمجھے بے خطا تم ہو
علی مولائے کل مشکل کشا سب کچھ سہی لیکن
شفیع عاصیان عرصہ روز جزا تم ہو
میں واقف ہوں کرم سے نام ہے فضل امام اپنا
برستی ہے جو رم جھم شان رحمت کی گھٹا تم ہو

ایک حدیث شریف ہے "اسلام کا آغاز غربت سے ہوا، پھر عنقریب وہ غریب ہو جائے گا"۔
واقف اسے خوش خبری سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی منقبت "دربار خواجہ میں" فرماتے ہیں

امیر سلطنت مصطفیٰ غریب نواز
نشان دائرہ لافتیٰ غریب نواز
بہ شان حیدر کرار جلوہ فرما ہیں
دیار ہند میں مشکل کشا غریب نواز
عنایتوں کے جو دریائے بیکراں ہیں علی
نوازشوں کی برستی گھٹا غریب نواز
سنی حدیث فطوبیٰ تو جھوم اٹھی امت
زبان کلمہ پہ جاری ہوا غریب نواز
رسول پاکؐ کے خلق عظیم کے پیکر
لیے مجسمہ مرحبا غریب نواز

لب سکوت محبت تجھے مبارک ہو
سمجھ رہے ہیں ترا مدعا غریب نواز
یہ تیری حاضری آستانہ اے واقف
کرم ہے، ورنہ کہاں تو! کجا غریب نواز

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، واقف کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ شریعت و طریقت کے رموز کے بھی رمز شناس تھے۔ انہوں نے صوفیائے کرام سے اپنی عقیدت مندی میں متعدد منقبت کہیں۔ حضرت مخدوم جہاں کی بارگاہ میں اپنی جن کیفیات کا اظہار کیا ہے، اس میں ان کی عقیدت مندی دیکھی جا سکتی ہے:

شریعت کی زباں تم ہو طریقت کا بیاں تم ہو
شرف ہے جس سے دنیا ... مخدوم جہاں تم ہو
گلوں کی چاک دامانی کی رنگیں داستاں تم ہو
منادل کی فغاں میں روح نغمات اذاں تم ہو
[illegible]
[illegible]
نبیؐ کے لاڈلے، یحییٰ منیریؒ کے جگر پارے
[illegible]
نہ بھولے تم مجھے عند ملیک مقتدر ہو کر
[illegible]
تمہاری بارگاہ فیض میں واقف بھی حاضر ہے
زمانہ جانتا ہے علم و فن کے قدرداں تم ہو

واقف نے اپنے جد امجد سید شمس الدین شمس ارولی کی شان میں جو منقبت کہی ہے، وہ درج ذیل ہے:

لوح محفوظ ترا ، عرش معلی تیرا
شاہ سمن ! ہے خدا داد یہ رتبہ تیرا

میں نے اجمیر کے آئینہ میں پایا تجھ کو
عکس تیرا تھا جمال رخ زیبا تیرا

ساز دل تجھ کو دیا خواجہ اجمیر نے جب
زمزمہ سنج ہوا کوہ ہمالہ تیرا

عرس سالانہ ترا گیارہویں رمضان کو ہے
سینکڑوں سال سے ارول میں ہے میلا تیرا

ہر مسلمان کو حاصل ہے حمایت تیری
حاصل کلمہ توحید ہے چرچا تیرا

ہے خزانے میں ترے سائل ومحروم کا حق
صاف کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ تیرا

صرف قرآں کی تلاوت ہے ترا فیض مسلک
اسہل الطرق الی اللہ ہے طریقہ تیرا

اس کو قرآں سے شفا مل گئی اللہ اللہ
اس بیمار نے جب پایا سہارا تیرا

اولیا میری نگاہوں سے کہاں چھپتے ہیں
شاہ سمن کوئی ثانی نہیں دیکھا تیرا

بڑھ گئی سید جیلاں کی عنایت مجھ پر
انہیں معلوم ہوا جب ہوں میں پوتا تیرا

طبع واقف کی روانی ہے کرامت تیری
موج در موج ہمیشہ ہے یہ دریا تیرا

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں واقف کے ہاتھوں نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی نشاۃ ثانیہ ہوتی ہے۔ موضوعات تو جیسے ان کے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، جس کی ہر لہر ان کی گرفت میں ہو، ایسا باخبر اور باظرف شاعر جو ندرت سخن اور جودت طبع سے لیس ہو، ماضی بعید میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی نگاہ اسلام کے شاندار ماضی کے اہم واقعات کی طرف تو ہے ہی،

حالات حاضرہ کا کوئی بھی چھوٹا بڑا موضوع ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ ذیل کی نظموں کے عنوانات سے یہ حقیقت مترشح ہو جاتی ہے:

"حالات حاضرہ کے تلخ و شیریں کا مبصرانہ جائزہ"، "حالات حاضرہ کی روشنی میں دعوت فکر"، "حالات حاضرہ کے اندھیرے اجالے"، "حالات حاضرہ کی بیہودہ سامانیاں"، "حالات حاضرہ کے اندھیرے"، "دوستی چال بازی ہے سیاست اے دوست"، "علامہ اقبال کی نیشنلوجی اور ان کی اسپرچول ازم"، "قدیم ہندوستان کے عظیم فلسفی بید پائے برہمن کی یاد"، "فسادات اور دل ناتواں کے اندیشے"، "قرآن اور دل والوں کی یاد ماہ رمضان المبارک میں"، "تو مومن و پنہاں ہے پدیدار ازل سے"، "ماہ رمضان"، "پیام ماہ رمضان المبارک"، "روزنامہ سنگم میں توہین رسالت کی خبر پڑھ کر"، "فلسفہ امن و امان"، "روزنامہ سنگم میں پنجاب کے حالات پر کلدیپ نیر کا مضمون نگاہ واقف میں"، "ہماری کے نام"، "نیشن اور حالات حاضرہ کا دلچسپ جائزہ"، "بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی شرکت و مدد مشرکت کے متعلق ایک مخلصانہ مشورہ کے نام"، "نامعلوم مدت تک دہلی میں کرفیو کا نفاذ"، "مرکزی وزیر داخلہ کے خداوندان مجازی"، "پٹنہ اسٹیشن پر ریلوے حادثہ"، "مجنوں نوجوانوں سے دعا" وغیرہ وغیرہ۔

نمونے کے جو مقالات ہیں ان میں سے بعض میں انہوں نے عالمی سطح پر اسلام کی مسابقت، بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں، سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم وغیرہ کی قلعی کھولی ہے، جو اپنے طلب سے متعدد مسائل مثلاً غربت، افلاس، جہالت، فرقہ وارانہ فسادات، سیاست دانوں کی بیجا بازیگری، زوال پذیر معاشرہ، ذات پات کی سیاست، نسلی تصادم، جھوٹوں کی نت نئی پالیسیاں، عدل کی اقتصادی صورت حال، سائنسی پیشین جیسے موضوعات پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں خصوصیت سے سیاسی قائدین، علماء، واعظ، فرقہ پرست عناصر اور ٹھیکیداروں کی مذمت بھی کی ہے۔

واقف محض تخیل کی دنیا میں رہنے والے شاعر نہیں حقیقت پسند اور باغی فطرت تھے۔ زہر ہلاہل کو قند کہنے سے انکار کرتے تھے اس لیے ہر اس مرض پر انہوں نے انگلی رکھی، جو ملت کو کھوکھلا اور فرسودہ کر رہا تھا۔ "واقف کہتا ہے" کے تحت نظموں میں تو وہ ایک مصلح نظر آتے ہیں، جس میں انہوں نے ملت کے رستے ہوئے زخموں کا پرچار بھی کیا اور مصنوعی سدھار کے پیچھے کا مکروہ بھی اجاگر کیا۔ چنانچہ ان کا قلم کہیں جارحانہ، کہیں ناصحانہ اور کہیں ہمدردانہ چلا۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

حقیقت اس میں صرف اتنی سی ہے اے دوستو! سن لو
جو بیہودہ تھا اس موذی کو بے ہودہ لکھا میں نے
مگر جو لوگ اچھے ہیں بڑھایا حوصلہ ان کا
بہ بانگ صور اسرافیل انہیں اچھا لکھا میں نے

یہاں ان کی نظموں سے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں

اردوئے معلیٰ کی ادا بھول رہی ہے
وہ حرف و سخن صوت و صدا بھول رہی ہے
جو اس نے پڑھا اس نے سنا، بھول رہی ہے
اسلاف نے کیا اس کو دیا، بھول رہی ہے
کب اس نے کہاں کس سے لیا، بھول رہی ہے
کب اس کو کہاں اس نے دیا بھول رہی ہے
وہ بھولی ہے اب پرچھوا دیا کیجئے ہم پر
اردو میں وہ اب نام خدا بھول رہی ہے
اب اس کو مزا ملنے لگا رام بھجن میں
وہ حسن علی سیدنا بھول رہی ہے
ہندی میں وہ کرتی ہے قرآں کی تلاوت
معلوم نہیں اس کو، وہ کیا بھول رہی ہے
آگاہ نہیں اب وہ نسیم سحری سے
کیا چیز ہے یہ 'بادصبا' بھول رہی ہے
کیا ربط اسے 'قافلہ سالار حرم' سے
اقبال کی جب بانگ درا بھول رہی ہے
الفاظ میں ہیں 'زندگی قوم' کے اسرار
افسوس یہی 'درس بقا' بھول رہی ہے

دنیائے معانی میں جو برپا ہے قیامت
اس کو بھی یہ بے چشم وفا بھول رہی ہے
بے غیرتی قوم کی مظہر نہیں بالکل
لیکن یہ حیادار حیا بھول رہی ہے

(نظم: اردو کی نئی نسل)

تعزیت ہو غیر مسلم کی تو یہ جائز نہیں
اور ایصال ثواب و فاتحہ جائز نہیں
منحرف جو اس سے ہو وہ مرتد انجام ہے
منکر آیات قرآں دشمن اسلام ہے
ایسی حرکت کا حقیقی مدعا چیلنج ہے
یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے
اس امارت اور جمعیۃ کے علمائے کرام
اس ادارہ شرعیہ کے مفتیان خوش مقام
ایسی حرکت پر اگر خاموش ہوں زیبا نہیں
اپنے حجروں میں اگر روپوش ہوں زیبا نہیں
ان کو رہنا چاہیے چہروں پہ اپنے بے نقاب
ہو زباں پر ان کے جاری معنی ام الکتاب
نصرتِ دین شہ خیر الوریٰ ہے ان کا نام
حفظ آئین محمدؐ مصطفیٰ ہے ان کا کام
وہ نہ بولیں گر تو مجرم ہیں خدا کے سامنے
اپنے خالق مالک ارض و سما کے سامنے

(نظم: یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے)

آیا ہے یہ فساد تو آتا چلا نہ جائے
ہر نقش ایں و آں کو مٹاتا چلا نہ جائے

جو تشنہ کام جہل ہیں پیتے چلے نہ جائیں
بھر بھر کے جام جنگ پلاتا چلا نہ جائے
اس پردۂ فساد میں جو بدمعاش ہے
تگنی کا ناچ سب کو نچاتا چلا نہ جائے
سمٹے ہوئے غریب بکھرتے چلے نہ جائیں
گیسو وہ اپنے رخ سے ہٹاتا چلا نہ جائے
کمزور ہو چکی ہے جو دیوارِ اتحاد
ٹھوکر سے اپنی اس کو گراتا چلا نہ جائے
ابلیسیت کا خون جو اس کی رگوں میں ہے
روتے ہوؤں کو اور رلاتا چلا نہ جائے
ویرانہ فساد کے ہر گوشے گوشے میں
جوگی کوئی ستار بجاتا چلا نہ جائے
ڈرتا ہے دل زمانہ کے حالات دیکھ کر
ہر روز حشر تو وہ اٹھاتا چلا نہ جائے

(نظم: حادثات اور دل ناتواں کے اندیشے)

ذرہ ہے اپنے زور میں صحرا ادھر ادھر
قطرہ ہے اپنے جوش میں دریا ادھر ادھر
حزب مخالف اب نہیں متحد کہیں
لیکن اچھلتی پھرتی ہے بے جا ادھر ادھر
ہے کانگریس کے ساتھ ہر اک خانقہ نشیں
دل میں لیے ہوئے غم دنیا ادھر ادھر
ہر مولوی بحال ہوا کانگریس میں
لہرا رہا ہے اس کا عمامہ ادھر ادھر

دوڑ غریب کس کو دے گالی کسے نہ دے
ڈوبا ہوا ہے سوچ میں تنہا ادھر ادھر
بے ساختہ زباں سے نکلتی ہیں گالیاں
آتا ہے اس کے لب پہ جو شکوہ ادھر ادھر
زندہ ہوئے ہیں آج مسائل عوام کے
چھیڑا ہے زندگی نے فسانہ ادھر ادھر

(نظم الکشن اور حالات حاضرہ کا دلچسپ جائزہ)

حادثہ ہی حادثہ ہے ریلوے کا آئے دن
منچلے اب پائدانوں پر لٹکنا چھوڑ دیں
ریل کے ڈبے کی چھت پر چڑھ کے فرماتے ہیں وہ
[illegible] اپنے [illegible] میں منزل چھوڑ دیں
ان کی گمراہی پیام موت بن کر آگئی
راستہ پر اب بھی آجائیں بھٹکنا چھوڑ دیں
یوں تو ظاہر ہے کہ ہے بہکا ہوا سارا نظام
التجا میری ہے کم از کم بہکنا چھوڑ دیں

(نظم منچلے نوجوانوں سے التجا)

واقف کی قدر دانی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ [illegible] فی ابتدیہ [illegible] میں تو [illegible] رہ کار
تھے ہی، مرد مشاس بھی تھے اور قدر دان بھی۔ ۱۹ [illegible] ۱۹۹۹ء کو بہار راج [illegible] کی دعوت پر [illegible]
اس وقت سے [illegible] قدر دانی سے [illegible] کی غرض سے پہنچے۔ آپس میں خوش
[illegible] اور شعر [illegible] کی باتیں بھی۔ [illegible] پر [illegible] کے طور پر ایک نظم بعنوان "[illegible] مستعار
سے چند یادگار [illegible]" بھی [illegible] ہے۔ نظم اس طرح ہے

پڑ گئی ضعف بصارت پہ مرے ان کی نگاہ
دیکھا 'کنٹریکٹ' کو حضرت قدوائی نے

میرا دل جیت لیا ان کی پذیرائی نے
کوہِ الوند سے زیادہ نہیں دیکھا اونچا
دلِ صد چاک میں احساس کی گہرائی نے
چائے کے ساتھ چلیں شعر و سخن کی باتیں
وحدت فکر جو دی انجمن آرائی نے
آپ کے آرٹ میں ہے وسعت مضموں کتنی
اس طرح دادِ سخن دی مجھے دارائی نے
جو کیا تھا لب اعجاز مسیحائی نے

(ج) طنز و تغزل

واقف کے حالات نے جب کروٹ بدلی تو لوگوں کا مذاق سخن بھی بدلا، جس انداز کی غزلیں وہ ابتدا میں کہتے تھے، وہ ان کا شاہکار تو بنتی گئیں، مگر ان کی کفالت کا ذریعہ نہیں بن سکیں، لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے غزل میں ایک نئے لب و لہجہ کو متعارف کرانے میں ہی عافیت سمجھی، جس کی قارئین کی طرف سے بھی بے حد پذیرائی ہونے لگی اور پھر یہی ان کی شاعری کا وصف بھی بنا اور شناخت بھی۔ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد کی نسل کے لیے تو یہی انداز سخن ان کا شان امتیاز قرار پایا۔

اس عہد میں بہار ہی نہیں ملک و بیرون ممالک سیاسی و معاشرتی سطح پر ایک ہیجان اتھل پتھل مچی تھی۔ واقف نے موقع کی نزاکت کو سمجھا۔ ایک تو وہ خود بھی حالات کی ستم ظریفی کا شکار تھے۔ بال بچوں کو اللہ بھروسے آرا میں چھوڑ کر پٹنہ میں یوں زندگی گزار رہے تھے کہ "رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا عظیم آباد ہمارا" آبگینہ دل رس رہا تھا، جس پر انہوں نے توکل کا مرہم رکھ لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے غم جاناں کو نہیں غم کائنات کو گلے لگایا۔ جب یہاں آئے تو روزنامہ "سنگم" سے وابستہ ہو گئے، جو اس وقت مشرقی ہندوستان میں حزب مخالف کا سب سے بڑا ترجمان اور مظلوموں کی مضبوط آواز تھا۔ اخبار کے مدیر کی طرف سے فرمائشی موضوعات ملنے لگے اور وہ بھی اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھلاتے رہے، جس کی وجہ سے اخبار کے ساتھ ساتھ واقف کے قارئین کا بھی ایک وسیع حلقہ بن گیا، جو پابندی کے ساتھ ایسی چیزوں کا منتظر رہنے لگا۔ کبھی کبھی جب آبگینوں کو ٹھیس پہنچتی تو واقف کا

''سنگم'' سے طلاق بھی ہو جاتا اور پھر حلالہ کے لیے دوسرے روزناموں میں اپنی طبع رواں کا جوہر دکھا کر پھر ''سنگم'' سے رجوع فرما لیتے تھے۔ انھیں روزانہ کچھ نہ کچھ کہتے رہنا تھا، حالات حاضرہ ان کے لیے پسندیدہ موضوع بنا، جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کا ایک نیا رنگ سامنے آیا، جسے انھوں نے ''طنز و تغزل'' کا نام دیا۔ یہ ایک ایسا سکہ تھا، جو بڑی تیزی سے بازار میں چل گیا نہیں، دوڑ پڑا اور ان کا روز بروز مطالبہ بھی بڑھنے لگا، جن کی تنصیبات سے پٹنہ کے اخبار بھرے پڑے ہیں۔ ''طنز و تغزل'' نے لوگوں کے زاویہ نظر کو بدلا، ایک حوصلہ دیا اور نئی قوت بخشی۔ اس نے فرد اور سماج کی رہنمائی کی، اس کا وزن محسوس کیا جانے لگا۔ بقول واقف

> ''پٹنہ آیا تو ''سنگم'' میں پناہ لی۔ جاڑے کی ایک صبح تھی۔ نماز فجر کے لیے مسجد پہنچا۔ دیکھتا ہوں امام مسجد ایک سوتی چادر اوڑھے سردی سے کانپ رہے ہیں۔ مقتدی تھے چند، سوٹ، شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ [illegible] غارت کرے اس کو، [illegible] جس کا ایک شعر یہ ہے
>
> وہ نشہ ہے تیری نماز میں وہ خمار نار حرام ہے
> فقط ایک سجدۂ سہو ہے جو غریب تیرا امام ہے
>
> [illegible] بہت ممنون ہوئے''۔

واقف کی اختراع پسند طبیعت نے رنگ تغزل برقرار رکھتے ہوئے ''طنز و تغزل'' میں طنز کی ایسی آمیزش کی جس کی نظیریں کمیاب ہیں۔ وہ الفاظ سے تلخی کا ایک جہاں آباد کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا خود کہنا ہے:

> ''[illegible]''

اور انھوں نے ''طنز و تغزل'' کے تحت غزلیں، ایک نظم جہاں قومی و [illegible] کے ذہن و دماغ کو [illegible] دیتی ہیں، وہاں ایسے اشعار اور نظمیں بھی کہی ہیں جن کے معنی [illegible] ذہن کے [illegible] دیتے ہیں۔ چند مثالیں یوں ہیں

بازو پہ اپنے تمغۂ شیطاں لیے ہوئے
سر میں خیال قتل مسلماں لیے ہوئے

پھرتے ہیں سہسرام میں غنڈے ادھر اُدھر
تیر و سناں و خنجر و پیکاں لیے ہوئے
یہ ساحل سکون حکومت کا فیض ہے
قطرہ ہے سہسرام کا طوفاں لیے ہوئے
ہر صبح سہسرام ہے امید و بیم زیست
ہر شب وہاں ہے خواب پریشاں لیے ہوئے
اے چیف سہسرام کو بھی جائے دیجیے
لیکن نگاہ زہد پشیماں لیے ہوئے

ہے اپوزیشن بھی اک مسلک ہستی جناب
مجھ کو یہ سمجھے کوئی اقبال کا راہی جناب
ہے پریکٹیکل خوبی میری تاب جواب
اس جہاں میں ہے اصول زیست کی مٹی خراب

مرنی چشم رنگ [illegible] ہے
تھا ہاتھ بارہ انچ کا خنجر لیے ہوئے
بھائی کو ڈھونڈتے تھے کہ سارا جہاں گیا
وہ تھا کہ اڑ گیا صف محشر لیے ہوئے
کس طرح رنگ بدلتی ہے دنیا مردود
خود یہ مردود ہے اور اس کا تماشا مردود
میڈم اندرا کا جو فرمان قضا آپہنچا
ہو گئے محسن اردوئے معلیٰ مردود
آئی ایران سے اردو کی غزل میں بلبل
شور اس کا ہے نہ کوئل نہ پپیہا مردود

مجھے یہ کام تو گلفام ہے یا گل بدن ساقی
یہ میرا بھی وطن ہے جیسے اندرا کا وطن ساقی

صبا لگائے گی اندرا کو پھولوں کی چھڑیاں
نماز خدمت جنتا اگر قضا ہوئی

ہر ایک شے ہے گراں لا الہ الا ہو
ستم کدہ ہے جہاں لا الہ الا ہو
ملا نہ گوشت تو ہیں ساگ پات پر روزے
صدائے بے اثراں لاالہ الا ہو
سحر کے وقت بھی افطار جب نہ ہو واقف
تو کیا کہے گی زباں لا الہ الا ہو

وزیر خارجہ چین آئے بھارت میں
تمام دہلی میں غل مچ گیا ہوانگ ہوا
سنا ہے چین کی بھارت سے دوستی ہوگی
کریں گے ہند کو لطف آشنا ہوانگ ہوا
دیکھو اے گردش ایام! مزے کرتے ہیں
ٹیکس ہم دیتے ہیں حکام مزے کرتے ہیں

واعظان قوم بھی باسوز و ساز و باوضو
حضرت اقبال کے اشعار دہراتے رہے
بے خطر کیا کود پڑتے آتش نمرود میں
اس تصور سے بھی وہ خطرات جھجکاتے رہے

دوستو! گر جھوٹ کی پھنکار بڑھتی جائے گی
دیکھتے جانا خدا کی مار بڑھتی جائے گی
شعبدہ بازی پہ ہے جب دارومدار انتخاب
آپ گنتے جائیے سرکار بڑھتی جائے گی

اچھی نہیں ہمیشہ حقیقت کی بات چیت
کرتے ہیں لوگ اس سے شرارت کی بات چیت
مومن ہلاک لذت افطار ہوگیا
لیکن زباں پہ اس کی ہے جنت کی بات چیت

سنو پہلے کہ ہے معنی پیداوار اتپادن
کرو تم رفع حاجت اور لہو سو بار اتپادن
کئے جا ہاں کئے جا! اے مری سرکار اتپادن
بنے کشت زعفراں تیرا سر بازار اتپادن
کہا ڈنکی اتنی ملاں نے بانگ کاہی نے
ملوں میں اور حیواں میں مریں فنکار اتپادن
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری بھاتی انشا کو
کرے گا کیا کوئی دربار سے بے زار اتپادن
خبر دی حضرت اقبال نے زرخیز مٹی کی
کرے گی کشت ویراں ان کی اب نمدار اتپادن
چلو اے دوست اتپادن کا لے کر آنکڑا رکھ لیں
کہ موضوع سخن ہے برسر دربار اتپادن

بدل چکی ہے زمانہ میں فطرت شاہین
وہ روز و شب کسی الو کی بارگاہ میں ہے

بھارت کا ہے 'اقبال' کہ 'آزاد' ہیں غنڈے
گالی کے مصنف 'سخن ایجاد' ہیں غنڈے

گلفام ہیں، گل رخ ہیں، پری زاد ہیں غنڈے
نمرود ہیں، فرعون ہیں، شداد ہیں غنڈے

گاندھی کی 'اہنسا' پہ بھی احسان ہے ان کا
آزادی کی تاریخ کو بھی یاد ہیں غنڈے

ہر پولیٹیکل پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی
ہر قصر گراں مایہ کی بنیاد ہیں غنڈے

ہر مذہب و ملت میں رسوخ ان کا ہے یکساں
ہر قوم کے فرزند خداداد ہیں غنڈے

ہو بھری چھری ہاتھ میں ان کے تو سر راہ
معلوم یہ ہوتا ہے کہ جلاد ہیں غنڈے

ہو سامنے لیلےٰ تو ہیں یہ قیس برہنہ
شیریں نظر آجائے تو فرہاد ہیں غنڈے

ابلیس کو دعویٰ ہے یہ بیٹے ہیں ہمارے
گو حضرت آدم ہی کی اولاد ہیں غنڈے

ہر فن میں ہیں یہ طاق انہیں کیا نہیں آتا
ہر علم کے پیدائشی استاد ہیں غنڈے

کوئلوں سے بنا دیتے ہیں نقش سر دیوار
بے معنی ہیں اور مانی و بہزاد ہیں غنڈے

اے انجمن خفیۂ تنظیم فسادات
برباد ہوئے شہر تو آباد ہیں غنڈے

جو اسپ وقت تھا سرپٹ چہار گام چلا
بہ ناز و غمزہ چلا ، مست وخوش خرام چلا
ادھر سے لیچی کا رس بھیجا ان کو میڈم نے
اُدھر سے جانب بھارت ضیا کا آم چلا
بہت اہم ہے پھلوں کا تبادلہ اے دوست
خبر لذیذ تھی ذکر اس کا صبح و شام چلا
خدا معاف کرے میں فسردہ بیٹھا تھا
اچھل پڑا جو سنا اور شادکام چلا
نوید امن ہے صرف آم اور لیچی نہیں
میں دوستوں کو یہ دیتا ہوا پیام چلا

بقائے باہم نہرو کی یاد تازہ کر
میں یہ نظام چلاؤں تو وہ نظام چلا
بچھا نہ راہ عمل میں کمند مکر و فریب
کبھی نہ ہاتھ سے شمشیر انتقام چلا
زمانہ گرچہ ہے راکٹ کے دوش پر لیکن
بہ یاد ماضی تو رتھ اور تام جھام چلا
اصول کیا ہے؟ فقط زینت کتاب جنوں
تو 'ڈپلومیٹ' ہے دشمن سے اپنا کام چلا

اٹلی کا تیج پیس کے پھانک اے مریض عشق
میری دعا ہے تجھ کو لچکتی کمر ملے

بہار میں ۱۹۵۱ء میں اردو تحریک نے ایک منظم اور مضبوط شکل اختیار کرلی تھی، یہاں شروع

سے ہی اردو کو ثانوی زبان بنانے کا پرزور مطالبہ رہا۔ یہ کئی بار ایجیٹیشن ایشو بھی بنا۔ بالآخر حکومت وقت نے ۱۹۸۳ء میں بہار کے پندرہ اضلاع میں کچھ مخصوص معاملات میں اردو کے استعمال کے لیے اسامیوں کی تقرری کی۔ اس میں ہندی ٹائپسٹ کے بھی عہدے وضع کئے گئے۔ ان حالات کے پیش نظر واقف نے اپنے جس ردعمل کا اظہار کیا، وہ یوں ہے

زبان ثانوی بن کر ہوئی ہے جلوہ گر اردو
حکومت کا یہ سکہ ہے ادھر ہندی اُدھر اردو
زباں مصدر سے بنتی ہے جو اردو ہے وہ ہندی ہے
بڑھی ہندی مصادر کی بدولت بے خطر اردو
یہ آنا جانا کھانا پینا ہندی بھی ہے اردو بھی
نہ سمجھے تھے تو اب سمجھو پڑھو بے شور و شر اردو
جو ہندی فارسی کے رسم خط میں ہو وہ اردو ہے
اسی ہندی کو کہتے آئے ہیں اہل نظر اردو
ذخیرہ میں ہیں اس کے فارسی عربی کے اسماء بھی
تمہیں یہاں [illegible] ہے [illegible] شیر نر اردو

ثانوی درجہ اردو پہ بہت خوش ہے بہار
اس کی قسمت تھی ترا بندۂ احساں ہونا
مرد مومن ہے وہی صاحب ایماں ہے وہی
قومی یکجہتی پہ آئے جسے قرباں ہونا
نکسلائٹ بھی ترے اور پولس بھی تیری
دونوں کانٹوں کو ہے گلزار و گلستاں ہونا
در لیلیٰ پہ ترے مجنوں کا وہ روزۂ موت
اشک اتنے میں ذرہ کا درخشاں ہونا
تیری جگنی کا چمک کر وہ عروج پرواز
تیرے جگنو سے وہ جنگل میں چراغاں ہونا

تیرے ساحل پہ ہے بھیگے ہوئے الو کی طرح
جس کو اے پندرہ اگست آتا تھا طوفاں ہونا
لکھ دیا اس نے تجھے ایک محبت نامہ
تھا شاعر میں جو واقف کو غزل خواں ہونا

علمی وادبی نیز سیاسی وسماجی شخصیات سے بھی واقف کی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ سعدی، شیرازی، عرفی، نظیری سے لے کر میر، غالب، اقبال، اکبر، داغ، جگر وغیرہ کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نطشے، شیکسپیر، ملٹن بھی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ گاندھی، نہرو، آزاد، جوہر سے ان کی عقیدت مندی سب پر عیاں ہے، چنانچہ یہ اشخاص جا بجا ان کے کلام میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میر، غالب، اقبال، داغ، اکبر، عبدالعلیم آسی، حفیظ خیر آبادی اور ریاض خیر آبادی کی غزلوں کی بہترین تضامین بھی پیش کی ہیں اور محمد علی جوہر، محمد مسلم (ایڈیٹر سہ روزنامہ دعوت دہلی)، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، جدر مراد آبادی، مولانا آزاد سبحانی اور الطاف حسین حالی جیسے شعرا پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ اقبال انہوں نے بطور خاص اپنا موضوع بنایا۔ علامہ اقبال پر اگر ان کی تمام رباعیوں، نظموں اور غزلوں سے اشعار منتخب کر کے جمع کر دیے جائیں تو وہ ایک الگ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ یعنی انہوں نے فلسفہ اقبال سے رہنمائی میں بے شمار قطعات اور رباعیاں قلم بند کیں۔ واقف نے اپنی ایک مثنوی میں فرمایا تھا کہ انہوں نے اقبال کے خلاف چھ سو رباعیاں لکھی تھیں، جن میں سے بیشتر "انقلاب" لاہور میں شائع شدہ ہیں۔ یہاں صرف ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے:

شکوہ پڑھیے، جواب شکوہ پڑھیے
بیکار نہیں، سمجھ کر اتنا پڑھیے
پر جاں کی اماں ملے تو یہ عرض کروں
اقبال کو پڑھنا ہے تو کیجے پڑھیے

واقف نے مکالماتی انداز کی نظمیں بھی لکھیں اور سنائز معلی، سٹائر اور ہزل کے تحت بھی اچھا خاصا سرمایہ چھوڑا۔ اکثر کلام مختلف رسائل و جرائد کے نسخات میں محفوظ ہے۔

(و) واقف آرٹ

واقف بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انہوں نے قابل فخر غزلیہ سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کے مزاج کا طنزیہ مزاج سے بڑی ہم آہنگی تھی، جس میں ظرافت کی چاشنی بھی تھی۔ سنجیدگی اور تغزل کی آمیزش بھی۔ لہٰذا غزل کی نزاکتوں اور لطافتوں کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی طنزیہ غزلوں میں قدرت کاملہ کا وہ جوہر دکھایا جو میر اور غالب سے اقبال اور آج تک کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ واقف نے بعد میں "طنز و تغزل" کے نام سے ایک نئے انداز سخن کی بنیاد ڈالی۔ اب وہ روشن مزاج اور رنگین اس سے بھی ان کی طبیعت کی یہ ابی نہ ہوئی تو انہوں نے "واقف آرٹ"، "کائنات" اور "شذرات واقف" کے عنوانات سے نئی نئی اصناف وضع کیں اور ان عنوانات کے تحت اپنے افکار پیش کرتے رہے۔ "واقف آرٹ" کے ذریعہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۳ء تک اپنی قدرت کاملہ کا جوہر دکھاتے رہے جس نے دونوں جہان کی طرف متوجہ کر رکھا۔

"واقف آرٹ" واقف کی شعری کاوش کا نام ہے جو اپنے دامن میں مسائل حیات و کائنات لیے ہوئے ہے۔ اس آرٹ میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ہیئت و اسلوب کی انفرادیت کی بھی زیادہ قوت ہے۔ شاعری کی تیاری کے اور تب وہ بدلتے ہوئے حالات و کیفیات کو بدلتے ہوئے طنزیہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس فن سے کام لیا ہے جس میں ان کے لئے تنوع کا سامان ہو۔ لیکن اس آئینے میں انہوں نے دراصل اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ کی تہذیب، ثقافت، مذہب، سیاست، اقتصادیات، سماجی و معاشرتی مسائل، ادب، فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ ادب، صحافت اور اخلاقی معیار و اقدار کی زبوں حالی کے قلم کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ انسانیت اور انسانی قدروں کو محبت مند دیکھنا چاہتے تھے۔ دنیا کے کسی حصے میں ہونے والی بدعنوانیوں، عدم مساوات، ظلم و فساد، جہالت اور حکومت وقت کی بے حسی سے انہیں سخت دکھ ہوتا تھا۔ وہ ان میں توازن، اعتدال، اخلاقی مساوات، خود غرضی و مکاری، ہر قسم کے ظلم سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اور چاہے ایک زمانہ کے حالات سے نشیب و فراز پر مشتمل ہے۔ قطعات، رباعیات، غزلیات عہد کے شعرا قلم بند کرتے رہے ہیں لیکن واقف نے "واقف آرٹ" کے تحت پابندی کے ساتھ نظمیں، رباعیاں لکھیں، وہ تصور اور وہ صفت کی

تاریخ میں ایک نیا موڑ نہ ہوتا۔ طویل عرصے تک اتنے تواتر و تسلسل کے ساتھ صبح و شام زندگی کی بدلتی تصویروں منظر کشی واقف کے سوا کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ انہوں نے ایک فرض کی طرح اسے اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا۔ جو زیادہ تر روزنامہ "سنگم" اور کبھی کبھی پٹنہ کے دیگر روزناموں میں شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب وہ اپنی علالت کی وجہ سے دفتر "سنگم" نہیں آ سکے اور اخبار "واقف آرٹ" سے محروم رہا تو انہوں نے اس کی معذرت "سنگم" کے ذریعہ ہی "واقف آرٹ" میں یوں پیش کی

کل بہت بیمار تھا اور آج کچھ اچھا ہوں میں
رات بھر ہوش و حواس گفتگو کچھ بھی نہ تھا
پڑھ رہا تھا میں شفا کے واسطے الحمد بھی
دل میں لیکن نام یاس و آرزو کچھ بھی نہ تھا
اور 'فیرم فاس'، 'بارہ ایکس' میں کھا بھی رہا
صبح کو دیکھا 'بخار شعلہ خو' کچھ بھی نہ تھا
محسن انسانیت ہے 'سوشلز' بھی کس قدر
گرچہ اپنے دور میں یہ چار سو کچھ بھی نہ تھا
'سوشلز' کو تلخ رکھا اس کی تحقیقات نے
پاس اس کے شیشہ و جام و سبو کچھ بھی نہ تھا

عصری تقاضوں کے پیش نظر مدوّن "واقف آرٹ" کی شکل میں ان کا قلم خون جگر اگلتا رہا اور وہ اپنی زبردست تخلیقی قوت اور زبان و بیان پر دسترس کے نتیجہ میں نت نئے مسائل سے برسر پیکار ہوتے رہے۔ اس طرح یہ عوام کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ تو بنا ہی حکومت وقت اور صاحب اقتدار کے لیے بھی خطرے کی آہٹ تو کبھی بانگ درا ثابت ہوتا رہا، جن کی تفصیلات سے پٹنہ کے اردو اخبار بھرے پڑے ہیں۔ یہاں چند نمونے، دیکھتے چلیں۔ لکھنؤ شام اودھ، تہذیب و تمدن، علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے، مگر اس کا دامن بھی رہ رہ کر اپنوں کے خون سے لالہ زار ہوتا رہا

اے صدائے رومن امپائر! ڈیوائڈ اینڈ رول
شیعہ سنی لڑ گئے آپس میں کیا کہنا ترا

نوحۂ شام غریباں ہوگئی شام اودھ
سرخی خون شہیداں ہے یہ افسانہ ترا
میں نہیں کہتا کہ یہ صورت ہے نازیبا، مگر
لکھنؤ کا آئینہ ہے اب رخ زیبا ترا
لڑنے والے کیوں نہ لڑتے اور نے خم ٹھونک کر
کارفرما دست رنگیں تھا پس پردہ ترا
اس طرح آراستہ ہے ملک میں تیری بساط
چال 'فرزیں' کی ہے پیدل ہو یا ہو گھوڑا ترا
ہوگیا سر بر زمیں جب پرچم امن و سکوں
آٹومیٹک طور پر اونچا ہوا جھنڈا ترا

سید جعفر امام بہار کے وزیر اعلیٰ کے بی سہائے (۱۹۶۱-۱۹۶۳ء) کی کابینہ میں وزیر آبکاری تھے۔ بہار میں اسمبلی انتخاب کی مہم کے دوران جعفر امام نے بات دہرائی تھی کہ اگر وزیر اعلیٰ انتخاب ہار گئے تو وہ پٹنہ چھوڑ دیں گے۔ جعفر امام کی وطنی پٹنہ میں کاشت کاری تھی اور وہ کتے پالنے کے شوقین بھی تھے۔ سہائے متحد کے وزیر اعلیٰ پٹنہ اور ہزاری باغ دونوں انتخابی حلقوں سے ہار گئے۔ جعفر امام سے دعوی کی تلخی واقف نے یوں کھولی

ہائے وہ صحن وزارت کی چمن آرائیاں
اب کوئی وطنی اب کتا کہاں پائیں گے آپ
تھا یہ دعوی چیف منسٹر ہاریں تو پٹنہ چھوڑ دوں
چھوڑ کر پٹنہ کی گلیاں اب کہاں جائیں گے آپ
اب کہاں السیشین کتوں کی بزم رستخیز
اب کہاں جوئیں گے دو اب کس پہ غرائیں گے آپ

ایک زمانہ میں فرقہ وارانہ فسادات سے بہار کی سرزمین ہل رہی۔ رانچی، جمشید پور، ہزاری باغ، بہار شریف، بھاگلپور اور نہ جانے کہاں کہاں فرقہ پرستی کا ناگ پھن اٹھائے تھا۔ فسادات کو روکنے میں ناکام ہوتی حکومت کی خیریت کو واقف یوں بتاتے ہیں

مسموم ہے فضائے حکومت بہار کی
رفتار فتنہ خیز ہے ہر نابکار کی
کل پھر فساد ہوگیا جمشید پور میں
ایسی کی تیسی وعدہ و قول و قرار کی

راجدھانی پٹنہ سے گیا کی سمت چند میل کے فاصلہ پر واقع پرسا بازار ہے، جہاں ذات پات، رنگ و نسل کے نام پر بے قصور افراد کے ساتھ بے رحمانہ سلوک روا رکھا گیا، انسان تو انسان مویشی اور مکانات بھی نذر آتش کئے گئے۔ اس سانحہ پر واقف کا ردعمل ملاحظہ کریں، جس میں ان کی جزئیات نگاری داد تحسین کی مستحق ہے

کیوں ہوئے اس درجہ آتش زیر پا اے لیڈرو
کیوں ہے نیچی ذات میں ماتم بپا اے لیڈرو
ہو گیا پرسا میں بارہ آدمی کا قتل کیوں؟
کیوں انہیں زندہ جلا کر رکھ دیا اے لیڈرو؟
تھے وہ بے چارے غریبی اور تھا اعلیٰ ذات سے
کیوں ہوئی قسمت یہ سرزد پھٹا اے لیڈرو؟
سات عدد تم نے مویشی بھی جلا ڈالے وہاں
کاٹے، پتھر سے بیل کی یا تھی خطا اے لیڈرو؟
کیا یہی دیتی ہے اعلیٰ ذات پیغام حیات؟
کیا یہی ہے زندگی کا مدعا اے لیڈرو؟
کتنے تم بیدرد ہو، سفاک ہو، بے رحم ہو
اور پھر انسانیت ناآشنا اے لیڈرو
آہ جو مارے گئے انسان تھے، انسان تھے
یا کوئی تھا ان کا 'آدم' دوسرا اے لیڈرو؟
ابن آدم کو جلائے ابن آدم کا چراغ؟
یہ انا ہے شیطنت کی انتہا اے لیڈرو

انتظام آباد بھارت میں ہو تم 'دیپک کا راگ'
سازِ ہستی ہو نہ جائے بے نوا اے لیڈرو
ظالموں کو کر نہیں سکتی کبھی قدرت معاف
تم کو بھی پینا ہے اب زہرِ فنا اے لیڈرو

لندن میں گوروں اور کالوں کے درمیان جب نسلی فساد پھوٹ پڑا تو اس موقع پر بھی واقف خاموش نہیں رہے۔ ان مظلومین کی ہمدردی میں ان کا صدائے احتجاج دیکھئے

اس مہذب ملک میں بھی گورے کالے کا فساد
ارضِ پاکستان میں ہے 'چار مقتولوں' کی یاد
زد میں آئے انڈیا ہاؤس کے دو افراد بھی
ہوگئی مجروح خاکِ نہرو اور آزاد بھی

وزیر ریلوے سیدار ناتھ پانڈے کے زمانے میں کئی ریل حادثے ہوئے۔ پٹنہ جنکشن پر ہونے والے ایک ریل حادثے سے متاثر ہو کر واقف نے قلم سے ایک اشعاری لڑی جھڑنے لگی

ایک دو ہو تو کہوں اب کوئی تعداد نہیں
ریلوے حادثہ کی اب کوئی تعداد نہیں
یہ نتیجہ ہے فقط غفلت و نادانی کا
آپ کو اپنے فرائض بخدا یاد نہیں
اپنے ماتحتوں کا گر آپ قلع قمع کریں
میں یہ سمجھوں گا کہ حضرت ستم ایجاد نہیں
آپ احباب سے لے لیجیے کچھ قرض ادھار
آپ کے پاس اگر عقل خداداد نہیں
پٹنہ جنکشن پر یہ حرکتِ ناشائستہ
میں ہوں خاموش مجھے عادت فریاد نہیں
آپ کی اہلیت کار کا ہو جاتا حساب
ہائے افسوس کہ نہرو نہیں آزاد نہیں

بابری مسجد کے نام پر ملک میں دہشت گردی کا جو رقص برہنہ ہوتا رہا اور فسطائی طاقتیں جس طرح ایک خاص فرقے کو تختۂ مشق وستم بناتی رہیں، اسی پس منظر میں واقف کے چند اشعار اس دور کی بربریت کی عکاسی کرتے ہیں:

اولاد بابری کو مٹا دیں گے 'ہیجڑے'
چیلنج یہ بنام مسلماں ہے آج کل
سایہ ہے اس پہ گیسوئے سرمایہ دار کا
بالکل سیاہ شام غریباں ہے آج کل
ہر چیز کی گرانی ہے سر بر فلک نہ پوچھ
لے دے کے اپنا خون ہی ارزاں ہے آج کل
ہر سمت بُت پرستی ہے رتھ کے جلوس پر
یہ لیڈری بھی گنج فراواں آج کل

ڈاکٹروں کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن آج کل کچھ ڈاکٹروں اور ان کے عملوں کا مریض کے ساتھ ناروا سلوک سے آگاہ تو سب ہیں لیکن اظہار کی جرأت واقف ہی میں تھی۔ وہ ڈاکٹر کو فرعون سے تعبیر کرتے ہوئے اس صورتحال کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں

یہاں ہر ڈاکٹر فرعون بے ساماں نظر آیا
مسلماں بھی یہاں کا سخت بے ایماں نظر آیا
کرنل نگلی جنس اس کا شعور بدشعاری ہے
انگوٹھے پر ہے شیطاں کے جو اس کی ذمہ داری ہے
اسی کے رنگ میں 'اشرف' بھی اس کا ہے کیا کہئے
کسے تیر ستم کہئے، کسے تیغ جفا کہئے
چھری ان کی شناسا گردن بسمل سے ہوتی ہے
ملاقات مریض ناتواں قاتل سے ہوتی ہے
کوئی فریاد کرتا ہے جب ان کی بدسگالی پر
اتر آئی ہے ان کی بدزبانی ماں کی گالی پر

کچھ اس کے بعد ان کی فتنہ سامانی ابھرتی ہے
لیے بگلا سے ان کی 'جل پری' پانی ابھرتی ہے
خدمت ان کی واجب اور فرض آدمیت ہے
مریضوں سے جسے الفت ہے اس کو ان سے نفرت ہے

واقف نے اپنے عہد میں رونما ہونے والے تقریباً تمام واقعات و سانحات اور افرادِ زمانہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے، انھیں براہِ راست اور ہمیں درون پردہ۔ ایسی ہی ایک تصویر دیکھتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی میں دیکھی جا سکتی ہے

کہنے لگے جمن سے کل حضرت 'درگاہی'
اللہ کرے کم ہو کچھ تیری کم آگاہی
اس دور کی فطرت ہے عیاری و مکاری
بدگوئی و بدبینی، بدخوئی و بدخواہی
اب طائرِ لاہوتی عنقائے تصور ہے
جب آگئی شاہیں کے پرواز میں کوتاہی
جب صوفی و ملا ہوں دربارِ وزارت میں
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

[illegible] موضوع "واقف آرٹ" سے [illegible] انھیں بھی [illegible] اس معاملے میں اپنی [illegible] سے پیچھے [illegible] ایسی [illegible] مثالیں ان کے کلام میں [illegible] جا سکتی ہیں۔

واقف کی انھیں خوبیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۴ء [illegible] آرا کے زیرِ اہتمام [illegible] واقف [illegible] اردو [illegible] کرتے ہوئے کہا تھا

"واقف آرزو [illegible]

[illegible]

کے بس کا روگ نہیں۔ روزنامہ 'سنگم' پٹنہ میں 'وقفیات' اور 'واقف آرٹ' کے زیرِ عنوان جو کلام شائع ہوا ہے اس کا جواب اردو کی پوری ہجو یہ شاعری نہیں دے سکتی''۔

(''بشر'' کلکتہ ۶ر اکتوبر ۱۹۹۴ء)

یوں تو ملت پر پڑنے والی ہر افتاد سے واقف کا کلیجہ چھلنی ہوتا رہا، لیکن ۱۹۸۹ء کے بھاگلپور فرقہ وارانہ فساد سے وہ بہت رنجیدہ تھے اور عملاً بے بس، کر بھی کیا سکتے تھے، لیکن اپنی نوکِ قلم سے جو کام کیا، وہ تاریخ کی ایک سچائی ہے۔ ایک دن انہوں نے اس وقت کے گورنر یونس سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی، نظم کیا تھی مرثیہ کہنا بہتر ہے، جو ''سنگم'' میں شائع ہوئی

اک جلیل القدر پیغمبر کا تو ہمنام ہے
سورۂ یونس میں پنہاں زیست کا پیغام ہے
کہہ رہا ہے تجھ کو ہر پیر و جواں خوش آمدید
خضرِ ملت ہو تری عمرِ رواں خوش آمدید
شیشۂ دل میں مسلمانوں کی اب تصویر دیکھ
ہر سرِ مسلم ہے زیرِ خنجر و شمشیر دیکھ
دیکھ آبادی میں بے نام و نشاں ہے زندگی
اور ویرانے میں محوِ صد فغاں ہے زندگی
صفحۂ قرطاسِ بھارت پر نمایاں ہوگئیں
ہستیاں جو مٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں
خونچکاں خنجر بکف قاتل نظر آتے ہیں لوگ
اک بھیانک خوابِ مستقبل نظر آتے ہیں لوگ
اب نہیں باقی رہا مجھ کو کسی پر اعتماد
امن کا نعرہ مچلکہ اور ضمانت زندہ باد
تو اگر چاہے تو اس نکتہ کا ہوجائے نفاذ
بند ہوجائے ابھی فتنہ پسندی کا محاذ

اگرچہ ہوگی اس میں تھوڑی سی پریشانی تجھے
تیری یہ کاوش مگر کردے گی لاثانی تجھے
رحم فرما اس پہ اے عزت مآب، عالی مقام
گفت واقف ختم باید کرد اینجا والسلام

بقول خواجہ افضل امام:

"[illegible] صاحب آن [illegible] تشریف [illegible] میں شامل [illegible] قیام [illegible] واقف [illegible] واقف صاحب [illegible] ہزار روپے [illegible]

([illegible] ص [illegible])

[illegible] واقف [illegible] صاحب [illegible] واقف [illegible]

تبصرہ بڑا معنی خیز بھی ہے اور سبق آموز بھی:

اگرچہ قتل بظاہر ترے عدو نے کیا
مگر شہید تجھے تیری آرزو نے کیا
لگی جو سینہ پہ گولی یہ شرح صدر تجھے
قبول رب کریم و رگ گلو نے کیا
ہمیشہ مجلس اوقاف یاد رکھے گی
ادا جو فرض ترے خوں، ترے لہو نے کیا

[illegible] واقف [illegible] ہیں [illegible] واقف [illegible] واقف [illegible] واقف [illegible] ثبوت [illegible] اور [illegible]

''واقف آرٹ'' کی زبان کا مطالعہ بھی ایک الگ باب کا متقاضی ہے، جس میں انہوں نے عربی و فارسی کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان کا بھی برمحل استعمال بڑے فنکارانہ طور پر کیا ہے۔ چند مثال دیکھتے چلیں؛

مجھ کو یہ ٹیبل ٹاک کا ساماں نظر آیا
میں بھی چپ تھا ان کے فل سٹاپ ہو جانے کے بعد

چلو اے دوست اتپادن کا لے کر آنکڑا رکھ لیں
کہ موضوع سخن ہے برسر دربار اتپادن

واقف کے سامنے جو سماج تھا اور جو حکومت تھی، اس کے ردِ عمل میں انہوں نے کچھ ایسے اشعار بھی کہے

خدا پناہ میں رکھے حرام زادوں کو
جو بدمعاش ہے شیطان کی پناہ میں ہے

واقف کی اس طرح کی شاعری کو مبتذل اور سوقیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن بقول واقف دنیائے ادب میں حضرت سعدی ہی وہ پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے ''گلستاں'' میں ''ایں چہ حرام زادہ مردانند کہ در بارالسلطنہ جہاں را مشوہ'' کہہ کر لفظ حرام زادہ والی ناشائستگی کا جزو لازم بنا دیا۔ اگر حضرت سعدی کی سند استاذ ذوق کے پاس نہ ہوتی تو رقیب کو اس آسانی سے حرام زادہ کہنا ان کے امکان سے باہر تھا

پہنچا ہے اب کمند لگا کے وہاں رقیب
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

سچ ہے اردو شاعری میں واقف اپنے اس آرٹ کے خود موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ان کی حیثیت دنیائے سخن میں ایک معمار کی ہے، جس پر اردو شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ ''واقف آرٹ'' حقائق کی ترجمانی، عصری حسیت کی عکاسی اور جذبہ خلوص کی آئینہ داری کا دوسرا نام ہے، جو ان کے پختہ سماجی شعور اور فنی مہارت کا ملا جلا ہے، جس کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔ بقول واقف۔

ملی جلی حقیقتوں کا نام 'واقف آرٹ' ہے
الگ الگ نہ پوچھئے جدا جدا نہ پوچھئے

واقف بحیثیت نثر نگار

(الف) تنقید

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے واقف کی نثر سے متعلق کہا تھا

"اگر علامہ واقف کو نظر انداز کیا گیا تو بیسویں صدی کے صاحب طرز نثر نگاروں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی"۔

واقف جیسے صاحب طرز اور دیدہ ور نقاد کی تنقیدی خدمات کا نہ اب تک جائزہ لیا گیا، نہ ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی، بلکہ اہل نظر نے چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے اپنے منفی رویہ کا ثبوت دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ واقف کے مزاج میں تنقید کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا اور تا عمر انہیں اپنی شاعری اور نثر میں قدرت برتتے بھی رہے۔ ان کی صحافتی شاعری کے علاوہ "نقد و نظر"، "واقف آرٹ" اور "خاکے اور دھماکے" کے تحت لکھے گئے اشعار اور نثری تحریریں دراصل ان کی تنقیدی بصیرت کا ہی پیش خیمہ ہیں۔ وہ بلا تکلف ہر ادبی صنف پر منظوم تبصرہ لکھ کر دنیائے ادب کو آئینہ دکھاتے رہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں ہمدردانہ شوخی سے لبریز ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس کی جہات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ واقف مارکسی نقاد میں شمار کیا جائے، ترقی پسند نقاد کہا جائے یا علمی تنقید نگاروں کی فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا جائے۔

بہر حال، ان کی تنقید نگاری کا ہمہ رخ آئے دن رونما ہونے والے حادثات و واقعات کے ساتھ قدماء و معاصرین کی شعری و ادبی نگارشات تھیں جن سے جب ان کا تنقیدی ذہن ہمیشہ متحرک اور فعال رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی غیر تنقیدی تخلیقات میں بھی تنقیدی رنگ نمایاں تو نہیں زیریں سطح پر صاف دکھائی دیتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اب تک ان کے تنقیدی مضامین، بیان کے تنقیدی شعور پر مبنی اشعار کا مجموعہ یا کتاب منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ "مضامین واقف عظیم آبادی" اگرچہ اپنے عنوان سے کس مضمون کا پتہ دیتا ہے لیکن اس کے بیشتر مضامین ان کے تنقیدی رویے کے ترجمان ہیں جن میں مرزا بیدل اور قاضی عبدالودود ... ہندی از صبی نہ ضرورت ... مولانا عثمان فارقلیط کی فوتی

سطح اور امام غزالی'، 'مجھے دیوان غالب پسند آیا' وغیرہ بطور خاص اہم ہیں۔

واقف کی تنقید نگاری پر عبدالوحید کا ایک مضمون تقریباً پچیس سال قبل دوماہی ''زبان وادب'' پٹنہ میں ''علامہ واقف آروی بحیثیت ناقد'' شائع ہوا تھا، جس میں واقف کے تین تنقیدی مضامین (طبیب آروی کے مجموعہ کلام کا تعارف، تاج پیامی کی شاعری پر تین مضامین اور شاد عظیم آبادی مرحوم کی ندرت سخن) کے حوالوں سے بحث کی گئی تھی۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون کے آخر میں ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ:

> ''جناب واقف آروی مرحوم نے باضابطہ تنقیدی مضامین نہیں لکھے، لیکن ان چند مضامین میں بھی ان کی تنقیدی صلاحیت اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان کی تنقید بڑی منطقی، صاف ستھری اور بے باک ہوتی ہے۔ ان کی تنقید میں تاثراتی تنقید اور عملی تنقید کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ زبان نہایت شستہ اور رواں ہے، جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں، اس کا ابلاغ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ان کی تنقید پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی ساری خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں''۔

(زبان وادب، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۔۔۔)

واقف کے تنقیدی مضامین کے بکھراؤ کی وجہ سے اردو دنیا ان کے اس 'جزو' کو ان کی تنقید کا کل سمجھ بیٹھی ہے جب کہ اردو زبان کی پیدائش، 'مطالعہ غالب'، 'کلدستہ برسر مہ شاط' (ثاقب عظیم آبادی کے کلام کا جائزہ) ان کی بہترین تنقید ہیں۔ صوفیانہ ادب کے حوالے سے بھی انہوں نے جس قدر تنقیدی خدمات انجام دی ہیں، جو مختلف رسائل میں شائع شدہ ہیں۔

واقف کی شعر فہمی غضب کی تھی۔ وہ الفاظ کے زبردست مزاج شناس تھے اور ان کی طاقت و نزاکت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے بالکل اولین دور میں آرائے ایک مشاعرے کی صدارت فراق گورکھپوری فرما رہے تھے۔ ایک شاعر نے جب یہ شعر پڑھا

ذرا اے ناخدائے عشق میری رہبری کرنا
ہجوم یاس میں واماندگی محسوس ہوتی ہے

تو واقف کی رگ تنقید فوراً پھڑک اٹھی اور فی البدیہہ یہ شعر کہہ کے ''محسوس ہوتی ہے'' اور ''معلوم ہوتی ہے'' کے باریک فرق پر تنقید کر ڈالی۔ شعر ملاحظہ فرمائیں

یہی اک بات ہے جو اس گھڑی محسوس ہوتی ہے
کہ خامی حاصل صد پختگی محسوس ہوتی ہے

واقف نے جن امور کو اپنی تنقید کی بنیاد بنایا وہ ان کا اعتماد، آگہی تنقیدی طریق کار اور استدلالی

نقطۂ نظر تھا اور یہی ان کی تنقیدی ترجیحات بھی تھیں۔ میر، سودا، ذوق، غالب، مومن، حالی، اکبر جیسے اساتذۂ سخن کے نظریۂ فن، طرزِ اشعار پر انگلی رکھنا واقف جیسے سخن شناس کا ہی حق تھا۔ بدقسمتی سے واقف کی ایسی تنقیدیں اردو کے صاحبِ علم حلقوں تک نہیں پہنچ سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ واقف ایک صاحبِ طرز ادیب تھے، ان کی تنقیدی تحریریں تبحرِ علمی کے ساتھ انشا پردازی کے بہترین نمونے پیش کرتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ شاعری کی نسبت ان کی تنقید نگاری کی طرف لوگوں کی توجہ کم رہی، جب کہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے ان کی تنقید شاعری پر مقدم ہے۔ اسے بھی تعجب خیز ہی کہیے کہ تقریباً ساٹھ برسوں تک شاعری کے ساتھ نثر نگاری کے دامن کو وابستہ کرنے والے اس خود فراموش دانشور ادیب کے مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ ابراہیم کاشف نے ان کے انتقال کے تیرہ برسوں بعد "مضامینِ واقف عظیم آبادی" کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا، جس کی تقریب میں پروفیسر عبدالمغنی نے کہا ہے

> "علامہ شاہ فضل امام واقف بنیادی طور پر ایک شاعر تھے، ان کی نگاہیں ہمیشہ ارتقی تھیں۔ [illegible] ان کی ایک مضمون میں بہار، عظیم آباد اور ہندوستان کی یہاں تمدنی، تاریخی، ادبی صورتوں کی وضاحت سے بیان کی گئی ہے [illegible] مسلسل [illegible] ان کی طرف [illegible] مضطرب دل کی [illegible] ان کی تحریریں [illegible] مختلف [illegible] کی مختلف نہیں [illegible] ان کی [illegible] ہے [illegible] ان کی [illegible] ہے [illegible] ان کی [illegible] ہے

جمہوریت'' ''پٹنہ بھائی سیتا رامیا اور کانگریس'' ''عوام ہوشیار اور خواص تیار'' ''ہندوستانی مسلمانوں کو سلام'' ''سیکولر غالب، سیکولر مومن اور سیکولر شاعری'' ''چیچک اور مسدس حالی'' ''یہ ریڈیو پاکستان ہے، مطلع ملاحظہ فرمایئے'' ''ہاٹ لس ڈیموکریسی، بدس ڈیموکریسی اور رائف لس ڈیموکریسی'' ''چھلنی میں دودھ اور قسمت کوکالی'' ''مسز بھٹو کا زچہ خانہ'' ''سرکاری ساہتو، سرکاری رلیجیس ڈیوائن کے ابا جان'' ''علامہ اقبال اور ایک طوائف'' ''آنجہانی ہٹلری ایک تنظیمی حکمت عملی'' ''حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ اور صداقت آشرم'' ''خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ میں چرچل'' ''مسلم کلچر اور اقلیتی کردار صدائے ماضی سے نوائے حال تک'' ''مسلم کلچر اور اقلیتی کردار خطرات ہی خطرات'' ''مسٹر اولڈ ہم سیلاب عظیم اور خانساماں جی'' ''دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے'' ''مجھے دیوان غالب پسند آیا'' ''اندرے سادہ لوحی'' ''سعدی از مکی ضرورت'' وغیرہ۔

شگفتہ نثر اور باغ و بہار انداز میں لکھے گئے یہ تنقیدی مضامین پہلی نظر میں ہلکی پھلکی طنزیہ و مزاحیہ تحریر کا احساس دلاتے ہیں، جن کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں کیوں کہ متعلقہ موضوع کے تناظر میں عہد ماضی اور حال کے متعدد واقعات کے درمیان مختصر سیاسی و ادبی حوالے، برمحل اشعار اور ضرب المثل اور نفس مضامین کے دیگر امتیازات ہوائے ایک فرحت بخش جھونکے کی طرح قاری کو فرحت و انبساط کی کیفیتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ بعض مضامین فن انشائیہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں مگر ان کا اختصاص یہ ہے کہ ان میں ''باتیں بنائی نہیں گئی ہیں'' باتیں بنائی گئی ہیں۔ کچھ کی نوعیتیں تمدنی، سیاسی، تاریخی ہیں اور بعض ظریفانہ و مزاحیہ ہیں، جسے خود واقف نے ''واقف آرٹ'' کا نام دیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان مضامین کی روح میں اترتے اترتے یہ احساس ابھرتا ہے

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

''مضامین واقف'' ملکی و بین الاقوامی حالات کا اشاریہ ہیں۔ ان میں بعض بین الاقوامی حالات کی ستم ظریفیوں کے عکاس ہیں، جیسے مسز بھٹو کا زچہ خانہ، آنجہانی ہٹلری تنظیمی حکمت عملی، مسٹر اولڈ ہم، سیلاب عظیم، خانساماں جی وغیرہ عالمی، سیاسی بازیگری کا تبرا ہیں تو سرکاری ساہتو، سرکاری رلیجیس، ڈیوائن کے ابا جان، جمہوریت کی چڑیا کس شاخ پہ بیٹھی ہے، پٹنہ بھائی سیتا رامیا اور کانگریس، اس وقت کی ملکی صورتحال کا مرثیہ ہے، جب کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں چرچل، امیدی کرن عبدالغفور، کرناٹک کا پہاڑ وغیرہ مقامی و علاقائی موضوعات سے متعلق ہیں، البتہ سیکولر غالب، سیکولر مومن اور سیکولر شاعری، سعدی از مکی ضرورت، مجھے دیوان غالب کیوں پسند ہے جیسے مضامین ذہن قاری کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ چیچک اور مسدس حالی، یہ زہریلے دودھ کے زہریلے محسن، علامہ اقبال اور ایک طوائف، دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے جیسے موضوعات تفریح و تفنن کے ساتھ ہماری فکر کو بھی بیدار کرتے ہیں۔ چند اقتباسات درج ہیں

"میر تقی میر شاعر آدمی تھے، انہوں نے گلاب کی پنکھڑی دیکھی اور لبوں کی نازکی کو تشبیہ سے رنگین کر دیا۔ حقائق و مظاہر کا شعور احساس، مراد ادراک جس کو براہ راست ہو جائے، وہ طبیعتاً شاعر ہو جاتا ہے، خواہ اس کے سب زندگی بحر ردیف و قافیہ سے ناآشنا ہیں، علم ہر جگہ بڑھ رہا ہے، شعور ہر جگہ گھٹتا جا رہا ہے۔ دنیا کی اصلی عصبیت یہی ہے، جب باہم کی اصطبلیوں سے بیزار ہو کر لوگ بیٹھ جائیں تو جستجوئے حقیقت، مرقعہ انسانیت کا جذبہ زندہ مسلم فسادات، جنگ اور ورلڈ وار کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا شہاب الدین ندوی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے علم کا گھوڑا زیادہ تیز دوڑتا ہے، یا ان کے شعور کا نور؟

راقم الحروف کو ان کی ذات گرامی سے اس لیے دلچسپی پیدا ہوئی کہ موصوف کو قرآن کی تحریف معنوی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ کا ترجمہ اس آن بان سے کون کر سکتا ہے کہ 'معروف' کا ترجمہ جانی پہچانی حقیقت اور 'منکر' کا ترجمہ امر ناشناس ہو جائے۔ جانی پہچانی حقیقت تو پھول بھی ہے اور کانٹا بھی، زہر بھی اور تریاق بھی۔ مولانا ندوی کے علم کا گھوڑا بھی ہے اور شعور کا نور بھی، بجلی بھی ہے اور لوہی، اندر بھی ہے اور بھنور بھی۔

پھر یہ امر ناشناس بیجا ہے، جو منکر کے ترجمے کے طور پر مولانا ندوی نے ہماری قدیم سے حدیثیں درج فرما دیں جو نصاریٰ کی معنوی روح تحریف و تخریم میں بھی پانی پانی کر دیا۔

(مضامین واقف ص ۷۹-۸۰)

"آزادی ہند کی تاریخ اب ایک صدی کی داستان پر قابض ہو چکی ہے۔ دہلی کی مرکزیت، صوبائی خودمختاری، وفاقیت، اختیارات کے قانون سے فرسودہ اور فرق و شدہ کا رجحان رہی ہے۔ انگریز تہذیب نے تعزیرات ہند مرتب کی اور حق یہ ہے کہ انگریز نے قانون سازی میں تعزیرات ہند کا علمی اور فنی مرتبہ جرم و سزا کی قدیم سیاسی تعریف کے مطابق جامعیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ مگر علم قانون اور علم سیاست کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ تہذیب کا تصور حکومت چند اشیاء کی مدد اور عوام کی باہمی حق تلفیوں سے متعلق ایک تعزیری طاقت کی حد تک محدود تھا۔

اس وقت حکومت ایک فنی طاقت تھی اور اس کے پاس فنی قوانین سے [illegible] سرمایہ موجود تھا۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کا شیطانی نظریہ حیات بھی اپنی ساری تباہ کاریوں کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے مگر اس نظریہ تاریخ کا [illegible] ہوں اور علمی تباہیوں سے

ذریعہ گھر گھر پھیلا دینا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اکبرالہ آبادی کا احساس چیخ اٹھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

غلط تعلیم نے دلوں کی بستی اجاڑ کر رکھ دی۔ انسان کے بچے درندے، بہائم، بھیڑیے، اور چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانے والی بڑی مچھلی بن کر نادر، چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کرنے لگے، اپنے مفسدانہ طرز عمل کے لیے ان کے پاس تنازع للبقا کا فارمولا موجود تھا، جس پر فلسفیانہ طرز کی انگریزی مہریں ثبت تھیں۔ اب کمزوروں کے لیے چرخ نیلی فام کے نیچے پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی، کیوں کہ وہ چھوٹی مچھلی تھی اور چھوٹی مچھلی ہونا جانے خود وہ جرم ہے، جس کی سزا بڑی مچھلی اس کو نگل کر یقیناً دے گی"۔

('مضامین واقف' ص: ۲۳-۲۴)

"ان سے ڈیڑھ دو سو سال قبل چیچک یورپ کی مہلک بیماری تھی۔ چین میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک حکیم نے اس مرض سے بچنے کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جو لوگ چیچک سے صحت یاب ہو جاتے تھے، ان کے کپڑے اتار کر ان کے بچوں کے گلے میں ڈال دیے جاتے تھے، چیچک کا مرض ان پر کبھی حملہ نہیں کرے گا، چین کا یہ نظریہ علاج چلا تو یورپ نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ چیچک کے مریض کے دانوں اور چھالوں کا پانی سوئی کے ذریعہ تندرست آدمی کے جسم میں داخل کیا۔

ڈاکٹر جینر نے ۱۷۹۸ء میں نکتہ ایجاد کیا۔ اس نے اپنے تحقیقی طریقہ علاج پر پمفلٹ شائع کر کے یورپ کے ہر ملک میں پھیلا دیا، سارا یورپ اس کا معتقد ہو گیا۔ انگلستان کے بادشاہ نے اس پر انعامات کی بارش کر دی۔ سن لیا آپ نے؟ اس طرح مشرقی جہالت اور مشرقی جہالت کی قیاس آرائیوں پر یورپ کا تجربہ اندھے کی لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ اس وقت سرسید مرحوم کی وہ گالیاں خدا معلوم کیوں یاد آ رہی ہیں جو 'مسدس حالی' کی زبان میں خواجہ حالی مرحوم کے قلم فصاحت رقم سے ان لوگوں کو دی گئی تھیں جو طب یونانی کے معتقد اور شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے"۔

('مضامین واقف' ص ۴۰-۴۱)

واقف اپنے عہد میں رونما ہونے والی ہر ادبی و سیاسی تحریک اور فکر و عقائد کے علاوہ ملی، مذہبی، و سیاسی حالات و کوائف، نیز قومی اخلاقی صورتحال سے باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر مرض کا علاج دوا نہیں، جراحی بھی ہے، چنانچہ ان کے جذبات میں جب تلاطم پیدا ہوتا، دماغ میں طوفان اٹھتا، دل کی

دنیا میں ہلچل مچتی تو وہ کبھی "اخلاقی جمہوریت نجات کا واحد راستہ" کی تلاش میں نکلتے تو کبھی "گرانی اور مہنگائی بھتہ" کی مضحکہ خیزی پر ہنستے تو کبھی "مسلم کلچر اور اقلیتی کردار صدائے ماضی سے نوائے حال تک" کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے اور جب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے تو "مسلم کلچر اور اقلیتی کردار خطرات ہی خطرات" سے بھی متنبہ کرتے۔ اس پر مستزاد، ان کی پرشکوہ نثر جو انتہائی دلکش، موثر، چھوٹے چھوٹے سبک جملے، بامحاورہ زبان، فصاحت و بلاغت کا مرقع، دل کو چھو لینے والی عبارت آرائی اور اشارات و کنایات ان کے تخلیقی نثر کے حسن میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ہر دو چار جملوں کے بعد برمحل اشعار اور ذہن کے دریچوں کو کھولنے والے واقعات قاری کے دل پر اپنا خاص اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس پر ان کا مخصوص طنزیہ مزاحیہ پیرایہ، ظرافت و لطافت کے ساتھ پڑھنے والے کے دماغ میں ایک تازہ ہوا کی طرح داخل ہوتا ہے۔

واقف کے مضامین کا ایک انتخاب تو محفوظ ہو گیا لیکن ان کی تحریروں کا ایک بہت بڑا حصہ غیر منقسم ہندوستان کے رسائل و جرائد میں بکھرا ہوا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ جب رات پٹنہ منتقل ہوئے، اس کے بعد سے ان کے متعدد مضامین کے موضوعات کا دائرہ انتہائی وسیع ہوتا گیا۔ وہ ایک وقت تنقید نگار، سیرت نگار، وقائع نگار، سوانح نگار، مزاح نگار، انشائیہ نگار اور تجزیہ و تبصرہ نگار تھے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ موضوعات کے لحاظ سے مختلف النوع ہونے کے باوجود مختلف اصناف ادب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اس لیے ان کا اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے، جو ان کی تحریر کی پختگی کا نتیجہ تھی۔ ان کی ادبی تنقیدیں جہاں علامت روحی، سادگی اور سلاست کے ساتھ نظری ترجمانی کرتی ہیں وہیں مذہبی مضامین میں قلم کو عقیدت مندانہ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ ان میں نقد انتہائی نپے تلے اور سنجیدہ انداز سے ہوتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں شعری حوالوں سے، جا بجا آیات اور اسلامی واقعات سے اپنے موضوع کو مدلل و مستند بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ سیرت نگاری میں شخصیتیں ہمارے سامنے حقیقی پیکر کی نظر آتی ہیں، جب کہ وقائع نگاری میں واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے گھومتے ہیں۔ [illegible] اس کا ایک حصہ کتابی ہے۔ تاریخی، سیاسی و تاثراتی تحریروں میں وہ اپنی جولانی طبع و وقار میں رہتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں ان کی فیصلہ قوت بڑی طرح بیدار رہتی ہے۔ [illegible] ان کی تحریروں میں مشاہدہ ہے وہ ان کا علمی وقار، معلومات اور مطالعہ کا حافظہ ہے۔ ان کے بعض مضامین پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ سے متعلق ان کی معلومات جتنی وسیع تھی، اتنی ہی گہری بھی تھی۔ وہ تاریخ سے بھی مطمئن تھے اور سیاست سے بھی۔ دنیا میں روزمرہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا بھی انہیں گہرا علم تھا۔ مختلف ایجادات بھی ان کی نگاہ میں تھیں۔ [illegible] واقف کا بچپنا مضمون تصور کیا جاتا ہے ان

میں 'اخلاقی جمہوریت' ان کے افکار و خیالات کا نقطۂ عروج ہے، جو نذرِ قارئین ہے

اخلاقی جمہوریت

''اخلاقی جمہوریت کی روحِ عضوی جمہوریت ہے:

باطل کم سواد سبق قصہ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

جذبہ ہے، اختیاری کا سیاسی و اصطلاحی نام ہے، جس کے تحت انسان یہ اعلان کرتا ہے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سارے جہاں کا درد تو بڑوں کی باتیں ہیں، اگر چھوٹے سے چھوٹا پیمانہ فکر بھی ساری قوم کا درد، سارے ملک کا درد اپنا سرمایۂ حیات نہ سمجھے تو اس کا وجود انسانیت کے لیے پیغامِ ماتم ہے۔ یہ چیز مفروضہ نہیں، بلکہ مسلمات کا درجہ رکھتی ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے خادموں، نوکروں اور غلاموں کی ہے۔

اخلاقی جمہوریت اس اصول کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر جو قوانین بنائے گئے، جو احکام جاری ہوئے تاریخ کے وسیع اور عمیق تجربات نے ان کی ناکامیوں کی حسرتناک داستانیں دنیا کو سنائی ہیں۔ دنیا کو سورج، روشنی، ہوا، پانی، غذا اور دوسرے اسبابِ زندگی کی طرح فلسفۂ اخلاق کی ضرورت ہے۔

تہذیب شائستگی، آدمیت کے بغیر کوئی حکومت، کوئی قوم، کوئی ملک زیادہ دیر تک زندگی کے اسٹیج پر اپنا کھیل نہیں دکھا سکتا۔ باطل کے مورخ نے دنیا کو یہ بتایا تھا کہ خداوند خدا زمین پر اپنے نیک مزاج بندوں کو حکومت اور طاقت عطا کرے گا۔ انھیں سرسبز و شاداب بنائے گا، لیکن شریروں کے خیمے اکھاڑ دیے جائیں گے۔ تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی صالحین کی وراثت ارضی کا اعلان کیا ہے۔ گیتا میں بھی جس دھرم کی توہین پر کرشن جی نے مردِ غیب بروں آید و کارے بکند کی چیتاونی دی ہے۔ اس سے مراد یہی فلسفۂ اخلاق اور اس سے خیر متبادل بنیادی اصول ہیں۔

انگریزوں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ جمہوریت کے سب سے بڑے مدعی اور نقیب انگریز ہیں لیکن ان کے پاس دستور موجود نہیں، صرف رسم و رواج کی بنیاد پر محدود شہنشاہیت کے زیر سایہ کاروبار چل رہا ہے۔ ہندوستان میں جس وقت دستور سازی کی منزل سامنے آئی، انگریز کوئی نشانِ قومندے سکے۔ امریکہ اپنے دستوری امور میں ساری دنیا سے مختلف ہے۔ روس کو جمہوریت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس کے نظریۂ اشتراکیت مذہب ہی نہیں، بلکہ انسانیت کے بنیادی اخلاق کا بدترین معاند، بدترین دشمن اور مخالف ہے۔ رہا ہندوستان کے دستور ساز دماغ کو کیا روشنی ملتی" نتیجہ بے آب و رنگ جمہوریت اور اخلاق سے عاری، یا بے بنیاد جمہوریت کی شکل میں کاغذی پیرہن پہن کر نمودار ہوا۔ دستور ساز کمیٹی کی شاہی تحریر نے ہر نقش و نقش دنیاوی بنا کر رکھ دیا۔ آج یہ پیکر تصویر ہے جس دم بدم ارجا کر خاک کشتہ کیا جا رہا ہے۔ پھولوں کی ہنسی بھی آنسوؤں کے سب تماشا استعاروں سے ہر یہ شبنم بن چکی ہے۔

حکومت اور عوام دونوں اپنے اپنے طرزِ عمل کی حمایت میں دلیل کا دفتر لیے پھر رہے ہیں اور فلسفۂ اخلاق اپنے دونوں بازوؤں کو بیساں طور پر پھیلائے رہا ہے

دہر میں راز بقا آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ ساحل بن گئیں

آگے بڑھنے سے پہلے جناب کی تلخ تجربات کی روشنی میں مجبوری بن چکا ہے کہ یا طلب و خانہ کی آب سے بچنا ہے تو اپنی جمہوریت کو اخلاقی نظم عطا کرنی ہوگی۔ جس جمہوریت کی بنیاد اخلاق پر نہیں، وہ بے بنیاد جمہوریت ہے، ہوا میں معلق رہے گی اور اپنے ماننے والوں کو بھی ہوا میں معلق رکھے گی۔ وہ کاہر جھونکا اسے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف منتقل کرتا رہے گا۔ دستور میں ترمیم کی نزاکتوں کا اندازہ دیے بغیر کوئی قدم اٹھانا حد درجہ خطرناک ہے۔ میر تقی میر مرحوم کے یہ شعر ورنہ اصول کے طور پر سامنے رہیے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

جس وقت آپ ملی اخلاقی قدروں کو اپنی جمہوریت کی بنیاد اساس قرار دیں گے

اسی وقت سزا یافتہ غنڈے شہر اور دیہات کے جانے پہچانے لچے، لفنگے از خود حق رائے دہی سے محروم ہو جائیں گے، مگر ان کے دوسرے حقوق شہریت بدستور محفوظ ہوں گے، مگر ووٹ دینے، ممبر اسمبلی بننے اور وزارت کی کرسیوں پر ساری شرارتوں، بدمعاشیوں اور غنڈہ گردیوں کے ساتھ قبضہ کرنے کا پیدائشی حق ہوا میں گرد و غبار بن کر اڑ جائے گا۔ صحیح صالح اور صحت مند اخلاقی معاشرہ حکومت بنائے گا۔ ارکین حکومت کو منتخب کرے گا، شرارت پسند غنڈے ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی صرف تماشائی ہوں گے، یا زیادہ سے زیادہ چشم عبرت کے لیے ایک تماشہ ہوں گے۔ اخلاقی جمہوریت ان کی غذا، تعلیم، لباس، مکان، ملازمت اور کاروبار کا انتظام بہر حال کرے گی، لیکن انہیں رائے دہی یا حکومت سازی سے اصولاً بے دخل کر دے گی"۔

('مضامین واقف' ص:۱۰۱-۱۰۳)

واقف کے اس نوع کے مضامین نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نثر کی دوسری دنیا ان کے وہ تنقیدی مضامین ہیں، جو ادب سے بحث کے متقاضی ہیں، البتہ ان کا گل سرسبد ان کی غیر مطبوعہ تحریر "نگارشات واقف" ہے، جو انتہائی ضخیم بارہ جلدوں میں خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی ملکیت ہے اور ہنوز مسودہ کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسے کسی نے بہار کی ادبی و سیاسی تاریخ کا نام دیا ہے، کسی نے آرا کی ادبی تاریخ بتایا ہے، جب کہ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی فرمائش پر بہار کی ادبی، سیاسی اور سماجی تاریخ بھی لکھی ہے، جو تشنہ اشاعت ہے"۔ گو اتنے سارے تعبیرات سے "نگارشات واقف" خواب پریشاں ہو کر رہ گیا، یا بالفاظ دیگر "دی سلس بالانڈ مین اینڈ دی ایلیفینٹ" جیسی مضحکہ خیز صورت حال ہو کر رہ گئی۔

دراصل "نگارشات واقف" کے نام سے جو مسودہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے، اس بھاری پتھر کو لوگوں نے دور سے ہی چوم کر چھوڑ دیا، ایک دو ایسے خوش نصیب بھی ہیں، جن کو اس کی زیارت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ "مضامین واقف" کے مذکورہ اقتباسات سے کسی حد تک واقف کی نثر کے مجموعی رنگ اور اسلوب نگارش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ بغیر کسی اہتمام کے ساری عمر لکھتے رہے، البتہ ان کا غیر مطبوعہ مسودہ "نگارشات واقف" کا انداز ان کی دیگر تحریروں سے یکسر مختلف ہے اور یہ موضوع کے اعتبار سے بھی ان کا ایسا شاہکار ہے، جسے دیکھ کر حیرت ہوتی

ہے کہ علم و ادب اور شعر و سخن کے علاوہ ادب کے دیگر شعبوں میں ان کی ہمہ جہتی کتنی وسیع، وقیع اور پر معنی تھی، جو کام کسی ادارے اور اکادمی کا تھا، چند برسوں میں واقف نے اسے کر دکھایا۔ اس میں ادبیات، لسانیات، اسلامیات، سیاسیات کے علاوہ بے شمار موضوعات پر انہوں نے معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ ذیل کی متفرق مثالوں سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے متعلق ان کا نظریہ کیا تھا اور ادب، لسانیات کے باب میں ان کی کیا رائے تھی۔

اسلام سے متعلق واقف کے نقطۂ نظر کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کی نثری تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری سب سے پہلی وفاداری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ انہوں نے "کارشات واقف" میں اسلام سے متعلق اپنے جن نظریات و عقائد کی ترجمانی کی ہے، وہ دین اسلام کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ ان کے خیالات دیکھئے

"اسلام صرف ایک دین اور مذہب نہیں ہے، وہ ایک مستقل حیات اور ضابطۂ زندگی بھی ہے اور وہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ تمہاری روح پاک ہو جائے گی، وہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ اپنی تمہاری دنیا سنور جائے گی، وہ صرف آخرت کی تو دیہ نہیں کرتا، وہ دنیا کی بھی بہتری کی ہدایت دیتا ہے۔ وہ صرف عبادت ہے اور وہ جو نہیں ہے اس کا تخمین انسان کا کام ہے۔ وہ کام [illegible] کا جائزہ لیتا ہے اور حساب رکھتا ہے۔ اتنے [illegible] پیئے، [illegible] جائے [illegible] کتنے [illegible] جائے [illegible] پر اس کی قدر [illegible] چیز [illegible] جا چکا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ [illegible] آخرت [illegible] یا [illegible] آخرت [illegible] جائے گی۔ وہ دین [illegible] [illegible] زندگی [illegible] قرار دیتا ہے۔ وہ ایک [illegible] کی ضد اور مخالف [illegible] نہیں دیتا۔ وہ ایک [illegible] سے [illegible] اس [illegible] قرار دیتا ہے۔ جس [illegible] دنیا [illegible] دین بھی [illegible] کا قائل نہیں [illegible] دنیا نہیں برتتا [illegible] آخرت بھی [illegible] نہیں [illegible] اس نے [illegible] ایک [illegible] قرار [illegible] جنگ [illegible] میدان میں [illegible] خدمت [illegible] جدوجہد [illegible] اب [illegible] اس کی [illegible] ایک [illegible] مقصد کا تابع [illegible] ہے۔ مقصد [illegible] حاصل [illegible] ہے [illegible] دین [illegible] مذہب میں صرف اسلام

ہی حاصل ہے کہ اس صاف اور واضح الفاظ میں جہات، مراحل کی تعیین وتحدید کر دی ہے، تاکہ یہ بات پیش نظر رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے؟ ہمارے قول وعمل سے حاصل ہوا بھی کہ نہیں"۔

مردِ مومن کے فضائل وخصائل سے قرآن واحادیث بھرے پڑے ہیں۔ مفسرین ومحدثین نے بھی اس کی کافی توضیح وتشریح کی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار اس سلسلے میں ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کا فلسفہ مردِ مومن قرآن واحادیث کے تناظر میں مومن کے معیار، اقدار کو متعین کرتا ہے۔ علامہ واقف نے بھی "نگارشات واقف" میں مومن کے اوصاف حمیدہ پر انتہائی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ایک عام فرد اور مثالی مومن کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ یہاں "نگارشات واقف" سے صرف ایک اقتباس درج ہے، جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے

"دنیا میں جب کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے امید بھی ہوتی ہے، مایوسی بھی ہوتی ہے، ناکامی بھی، لیکن مومن ایک ایسی شخصیت کا مالک ہوتا ہے، جس کی جدوجہد میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ امید وکامرانی ہی ہے، مایوسی اور ناکامی کی پرچھائی بھی اس پر نہیں پڑ سکتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اس کے لیے کرتا ہے۔ اس کے لیے یہی بات کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں منہمک رہنا بھی کامیابی ہے۔ وہ جب کوئی کام شروع کرتا ہے تو اس لیے شروع نہیں کرتا ہے کہ کسی خاص منزل تک ضرور ہی پہنچ جائے۔ اس کی بارِ جیت کا معیار میدانِ جنگ نہیں ہوتا بلکہ اس کی اپنی ہی قلب ہوتی ہے"۔

حالی اور عہدِ حالی کا ذکر کرتے ہوئے واقف نے سینکڑوں صفحات میں اپنی علمی فضیلتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالی فخرِ مشرق تھے، انہیں کسی دیار، کسی دیس، یا علاقے میں محصور کرنا فعلِ عبث ہے۔ ذیل میں بخوفِ طوالت ایک مختصر اقتباس نقل کر رہا ہوں

"حالی کا سمجھنا آسان نہیں ہے، حالی محض کسی مشہور شخصیت کا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ حالی اس عہد کا نام ہے، اس قومی مزاج کا نام ہے، اس عقیدہ کا نام ہے اور اس معاشرہ کا نام ہے، جو ایک صدی قبل ہندوستان میں جاری وساری تھا۔ حالی فخرِ مشرق تھے لیکن یہ کہنا بھی ایسا ہے، جیسے زمین کی نصف آبادی دھوپ کی روشنی دیکھ کر یہ دعویٰ

کرے کہ آفتاب صرف ہمارا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی کسی دیس، کسی دیار، کسی ایک زمانے کے شاعر نہیں ہیں، ہر ملک، ہر ملت اور ہر عہد کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری زمان و مکان کی پابند نہیں، ان کی ادبی قدر دائمی ہیں۔ زندگی کا ایک آفاقی کائناتی پیغام ہے۔ حالی اور ان کا پیغام جغرافیائی منطقوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے آفاقی کلام کے نقطے سے وسعت دار و مل سکتی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد ہوتا ہے۔ حالی کی تخلیقی قوت پوری تیزی کے ساتھ ہجرت کے بعد دہلی میں ابھری اور جس شاعری کا آغاز ہوا وہ مستزید خاص سے متعلق تھا اور جس نے ہمیشہ جدید خاص حیات کے لیے رہیں ہموار کیں۔ لیکن حالی اس رمز کو بھی جانتے تھے کہ شاعری ساحری کا دوسرا نام ہے۔ وہ قوموں کو جگا بھی سکتی ہے اور سلا بھی سکتی ہے۔ وہ اقوام عالم کی آزادی کی تحریکیں جگا بھی سکتی ہے اور جگا سکتی ہے۔ اس اصلاحی دور میں جو کچھ حالی نے لکھا اس میں سادگی، سلاست، اصلیت، واقعیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ زبان بالعموم صاف، شستہ اور رواں ہوتی ہے۔ نگارشات عالیہ میں اکثر زبان کا انداز بدل جاتا ہے لیکن صلاح پسند حالی نے عملی قدم اٹھا کر نئی نسل کی صحیح رہنمائی کی۔ نجی خطوط تک میں بھی اس اسلوب و پیش کیا اور عملی پیرایہ خلاقی شاعری کو فروغ دیا۔ حالی طرز نو کے خالق ہیں۔ افسوس یہ تھی کہ زمانے کو بہار میں مختلف واقعات ایسے پیش آئے جن سے حالی کی تخلیقات ذہنی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ حالی کی ہمہ گیر حساس طبیعت نے ہر شاعر اور ادیب سے حد تک استفادہ کیا۔ لیکن بھی اس امر کو وہ اپنے کارنامے یہ وہ محبت قلب سے ہمیشہ اپنے محسنین کو یاد رکھا۔ شاعری کا جو نظریہ اور فن ارتقا نے پیش کیا تھا ہندوستان میں حالی نے اس نظریہ شعر کو پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ حالی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس کی تابناکی و ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ تعلیم دی کہ غزل میں سنجیدہ مضامین ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو ذوق محبت سے تمام جسمانی و روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی نقطہ ایسا نہ آنے پائے جس سے محبوب کی تحقیر ہو۔ غزل میں ایسے مضامین ہونے چاہئیں جن میں جوش، ولولہ ہو، فخر یا مسرت ہو، یا ندامت ظاہر ہو، یا جب وقار ہو، یا انصاف، یا غصہ، یا تعجب، یا امید، یا مایوسی، یا اقرار ہو، یا حب وطن ہو، کوئی امر انکار نہیں

کیا جا سکتا کہ غزل کا موضوع یکسر عشق و محبت کے سوا کچھ نہیں"۔

مذکورہ اقتباسات واقف کی معلومات عامہ کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کا دلکش انداز بیان قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسلوب میں خواہ مخواہ کا تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے، جو نفس مضمون سے مضمون کو اتنی دور لے جائے، جہاں سے لوٹنے میں دشواری ہو۔ واقف نے "نگارشات واقف" میں "طلسم ہوش ربا" کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ جس طرح پیش کیا ہے، وہ اہل نظر سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتا

"انسان بھی دریاؤں، پہاڑوں، ہواؤں اور موج ہوا کی طرح اپنے فطری ماحول میں رہتا ہے، لیکن انسانی فطرت کے دوسرے مظاہر میں ایک فرق ہے۔ دوسرے تمام مظاہر ایک دوسرے سے بے پروا ہو کر جی لیتے ہیں یا کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں، لیکن انسان ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ دوسرے مظاہر سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں اپنی زندگی میں سمو لینا چاہتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح مہک تو نہیں سکتا اس لیے پھولوں سے عطر نکال لیتا ہے، پھر عطر کو محفوظ رکھنے کے لیے عطر دان بناتا ہے۔ یہ ہے تمدن کا پہیہ۔ پہاڑ جب اس کی سربلندی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ انہیں تراش کر اجنتاؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ آبشاروں اور ندیوں اور ہواؤں کی گنگناہٹ سن کر وہ ان میں ایجاد کرتا ہے، سازندہ تا ہے اور شعر لکھتا ہے۔ یہ سماجی زندگی کا ارتقا اور فطرت کی کشمکش کی کہانی ہے۔ جب مرتا ہے تو فطرت کو خدا تسلیم کر لیتا ہے اور جب جیتا ہے تو چاند ستاروں پر جانے کی تیاریاں کرنے لگتا ہے۔ انسان اور فطرت کی یہی کشمکش ہماری جذباتی زندگی کی قیمت کرتی ہے۔ وہ کہانیوں اور کہانیوں میں یہی کشمکش سانس لے رہی ہے۔ اگر بادل نہ اٹھتے اور کالی گھٹائیں نہ اٹھتیں، اگر بجلی نہ چمکتی اور اگر بارش کے پہلے چھینٹے کا لمس زمین کو یوں نہ گدگداتا کہ اس کے آنچل میں بھری ہوئی خوشبو بکھر جائے تو ہم جری کے رسیے بول نہ سکتے۔ سماجی زندگی کا ارتقا انسان کی اور فطرت کی کشمکش کی کہانی ہے۔ اب ہمارے سامنے پہلا سوال یہ ہے کہ طلسم کس جغرافیائی وحدت کی نمائندگی کرتا ہے؟ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ داستان فارسی میں لکھی گئی، یا اردو میں، اس وقت یہ بات بھی خارج از بحث ہے کہ داستان تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، یا ترجمے کی، اس وقت تو طلسم کے علاقے کا تعین کرنا ہے"۔

(ب) صحافت

واقف نظریاتی طور پر جمعیۃ علماء ہند سے متاثر تھے، جس نے ملک میں دیگر تنظیموں کی طرح جنگ آزادی میں مرا نقدر کارنامہ انجام دیا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں وہ خود اور ان کا خاندان بھی سرگرم عمل رہا۔ کانگریس کو شروع سے اس خاندان کی حمایت بھی حاصل رہی اور آزادی کے بعد بھی وہ نظریاتی اور عملی طور پر کانگریس کے ساتھ رہے، لیکن واقف اس سے مستثنیٰ ہیں۔ زمینداری کے خاتمہ اور معاشی زوال انہیں پٹنہ لے آیا۔ وہ قلم کی مزدوری کے علاوہ دوسرا کوئی کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ انتہائی زیرک اور حساس طبع واقع ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد ملک میں برسر اقتدار کانگریس رہی اس کے باوجود اس کے دور حکومت میں اقلیتوں، پسماندوں اور دیگر طبقوں کے ساتھ ناروا سلوک سے وہ بہت متاثر تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی بعض داخلی و خارجی پالیسیوں سے بھی نالاں تھے۔ سرکاری تعلیمی، سماجی اور زرعی پالیسی سے بھی ان کا عدم اتفاق تھا، یہ ملک میں آئے دن رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، ذات پات کی تفریقیں، نسلی تشدد وغیرہ نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست پر ایک طرفہ کانگریس کا بغض و غلبہ تھا، جس کے بعض سیاسی لیڈروں اور حکام کے خلاف وہ اور بدعنوانی کے خلاف وہ پیار تھے۔ ان تمام پہلوؤں پر واقف کی تنقیدی نگاہ تھی۔ یہ دور تھا جب پٹنہ سے سب سے زیادہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان میں ایک آدھ میونسٹ اور سوشلسٹ نظریہ کا ترجمان تھا۔ باقی سبھی اخبار کانگریس نواز تھے۔ صرف روزنامہ "سلطان" پٹنہ جو بہار ہی نہیں پورے مشرقی ہندوستان میں اقلیتوں، مظلوموں، پسماندوں اور دیگر طبقوں کی آواز بھی تھا اور حکومت وقت کا شدید مخالف بھی۔ اس اعتبار سے "سلطان" وطن میں حزب مخالف کا سب سے موثر آلہ کار بھی سمجھا جاتا تھا، جس میں بڑے بڑے سیاست داں اور دانشوران کے مضامین، بیانات اور خبریں شائع ہوتی تھیں، جن پر حکومت وقت کی نظر رہتی تھی۔ "سلطان" نے یہ دور بڑے تلاطم کا دیکھا تھا۔ یہ واقف کے مزاج کے عین مطابق تھا اور "سلطان" بھی ایسے باضمیر اور باصلاحیت صحافی کی ضرورت تھی جو اس کے حق کے بڑھانے میں جرأت کی قربانی کے لئے تیار ہو۔ واقف کے اس زمانہ میں ایڈیٹر "سلطان" کام کرتے حکومت مخالف پالیسی کے الزام میں متعدد بار گرفتار ہونا پڑا۔ بقول غلام سرور:

''میری اور علامہ کی کوئی ملاقات نہیں تھی اور جب میں پہلی بار نظر بند ہوا، جب جیل کا آہنی دروازہ پشت پر بند ہو جاتا ہے تو ہمارے سامنے سارے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان کھل جاتے ہیں۔ اب واقعہ جو بھی ہو لیکن جیل سے میں نے لکھا (سید شاہ مشتاق احمد صاحب کو) میری جگہ علامہ فضل [illegible] واقف کو قائم مقام ایڈیٹر 'سنگم' بنایا جائے [illegible] دس روپے لینے والا یہ شخص اس وقت 'سنگم' کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جس وقت وہ دس [illegible] روپے لے سکتا تھا۔ واقف نے یہ سودا نہیں کیا، وہ چاہتا تو کر سکتا تھا۔ ایسے شخص کو خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے [illegible] کلکتہ سے 'سنگم' کا جو ایڈیشن نکلا تھا، اس کی ادارت بھی انہیں کو سونپا''۔

(''ایک شام واقف کے نام'')

ان نامساعد حالات میں غلام سرور جیسے عظیم صحافی کی نگاہ انتخاب واقف پر پڑنا اردو صحافت کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ غلام سرور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک چھ بار جیل گئے۔ اس درمیان اخبار بار بار سرکاری عتاب کا شکار ہوتا رہا۔ اس اعتبار سے بھی بحیثیت ایک صحافی واقف کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی تھیں، اخبار کی پالیسی کے نقطہ نظر سے بھی اور نظر و نسق کے لحاظ سے بھی۔ انہوں نے پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ وہ اخبار کے لیے اداریہ بھی لکھتے اور خبروں کی پالیسی اور حکمت عملی بھی طے کرتے۔ اگرچہ کسی اخبار کا اداریہ اس کے ایڈیٹر کا ہی سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ واقف کے اسلوب سے آشنا تھے، وہ غلام سرور اور واقف کے اداریوں کا فرق بآسانی محسوس کر لیتے تھے۔ بیباکی اور جرأت مندی دونوں کا شان امتیاز تھا۔ یہ سلسلہ کوئی سال دو سال نہیں، بلکہ غلام سرور کی رہائی کے بعد بھی جاری رہا اور وہ عملاً ''سنگم'' سے ساری زندگی وابستہ رہے، جیسا کہ ڈاکٹر ریحان غنی لکھتے ہیں

''یہ زمانہ غالباً ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۱ء کا ہے، علامہ سیدھے دفتر میں ٹہلتے ہوئے اخبار کے دفتر آجاتے اور آتے ہی مجھ سے پوچھتے کہ آج کی اہم خبریں کیا کیا ہیں؟ میں انہیں کچھ اہم خبروں کی سرخیاں اور ان خبروں کے کچھ متن سنا دیتا۔ علامہ قلم سنبھال لیتے اور ٹہل ٹہل کر اداریہ لکھنا شروع کر دیتے، جب اداریہ مکمل ہو جاتا تو کاتب کے حوالے کر کے کھانا کھانے ہوٹل چلے جاتے۔ علامہ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ ان کی کوئی نثری تحریر ہو، یا شعری نگارشات وہ پروف پر پوری توجہ دیتے۔ کتابت کے وقت کاتب

نے فل اسٹاپ، کومہ، انورنڈ کومہ کا خیال رکھا ہے، یا نہیں؟ اسے بغور دیکھتے، ورنہیں ہوتا تو ناراض ہوتے اور ڈانٹ پلاتے"۔

(ریحان غنی کی زیر اشاعت کتاب سے)

اسی کے ساتھ انہوں نے متوازی طور پر "سنگم" میں 'واقف آرٹ' کا مخصوص کالم بھی جاری رکھا، جس کے مدیر خود لسان العصر علامہ سید شاہ فضل امام واقف ارولی آروی عظیم آبادی تھے۔ یہ سلسلہ ان کے انتقال کے بعد ختم ہوا۔ یہ مخصوص کالم ان کے افکار و خیالات کا بے لاگ ترجمان تھا۔ اس میں انہوں نے ان تمام امور کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا، جو بسا اوقات ایڈیٹوریل، یا دوسری خبروں میں ممکن نہیں تھے۔ اپنی ایسی تحریروں میں وہ کبھی کبھی حد سے تجاوز بھی کر جاتے تھے۔ حالات حاضرہ پر ان کے مخصوص تبصرے حکومت وقت کی کاموں سے اوجھل نہ تھے۔ اگرچہ واقف کے خاندانی پس منظر اور ان کی علمی صلاحیتوں سے قائل بہار کے وزرائے اعلیٰ میں کے بی سہائے، دارو غہ پرساد، بندیشوری پرساد، چندر شیکھر سنگھ، جگن ناتھ مشرا، عبدالغفور وغیرہ کے علاوہ متعدد وزرائے کابینہ بھی تھے۔ ان میں سے اکثر سے ان کے براہ راست تعلقات تھے، مگر واقف انہیں بھی اپنی تحریروں میں آئینہ دکھاتے رہے۔ آزادی کے بعد وہ کبھی عملی سیاست میں نہیں رہے، مگر ملکی و ملی اور قومی امور پر کھل کر اظہار خیال کرتے رہے اور بلاشبہ انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا اور نہ کسی طرح کی سودا بازی کی، خواہ وہ کسی منصب سے متعلق رہے یا بلند مقام پر۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے سب کی خبر لی۔

واقف کی حقیقی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ روزنامہ "سنگم" سے وابستہ رہا۔ ان کی وہ کی حیثیت ایک فنی ادبی جرنلسٹ کی تھی۔ جب بھی کسی اخبار کے ایڈیٹر یا مالک کو ضرورت پڑی واقف کی خدمات حاصل کیں اور وہ کسی نہ کسی سے وابستہ رہے۔ ویسے بھی اخبار کو زیادہ سے زیادہ مقبول، دلچسپ اور عوام پسند بنانے کے لیے ان کی نگارشات مختلف روزنامے اور ہفتہ واروں میں شائع ہوتے رہے۔

خانقاہ منعمیہ سے ۱۹۰۹ء میں جب ایک دینی، ملی و ادبی ماہنامہ "المنعم" کا اجرا ہوا تو اس میں واقف کی تحریریں اور شعری کاوشات سے شائع ہوتے رہے۔ اس مجلہ کو ہر طرح سے پُر وقار اور معیاری بنانے میں ان کا بڑا عمل دخل تھا۔ انہوں نے ۱۹۰۲ء میں اپنا ایک ہفتہ وار "طشت از بام" جاری کیا تھا، جس کی مدت اشاعت بہت مختصر رہی۔ خوش کلامی کے ساتھ بہار کے بے شمار اخباروں کے علاوہ مختلف ملی، مذہبی و رفاہی اداروں سے آخر دم تک وابستہ رہے اور جاری رکھنے میں واقف نے کوئی

قدر کارنامے انجام دیے۔ وہ اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ بحیثیت ایک صحافی میدان صحافت میں ہمیشہ متحرک و فعال رہے۔ مگر افسوس کہ بہاری صحافت پر کام کرنے والوں نے انہیں فراموش رکھا۔ کچھ نہیں تو ایک طویل عرصہ تک پابندی کے ساتھ مدیر واقف آرٹ کے تحت انہوں نے صحافت کی، جو منظوم تاریخ رقم کی ہے، وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ ویسے انہیں اپنی ناقدری سے زیادہ ہم عصر صحافت سے انحطاط کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہاں صرف ان کے دو اقتباسات دیکھے جا سکتے ہیں

"جرنلسٹوں کی دنیا میں قول و فعل کا تضاد اس وقت بھی تھا، جب بوالہوسوں نے حسن پرستی کا شعار اختیار نہیں کیا تھا۔ آبروئے شیوۂ اہل نظر آس پاس ہی موجود تھی، زیادہ دور نہیں دیکھی، مرآج کا تو حال نہ پوچھیے۔ پٹنہ، کلکتہ، لکھنؤ، کانپور، دہلی ہر جگہ صحافت نگار سوسائٹی عرف ریڈیو ایڈیٹرس کانفرنس غالب کا مرقع پیش کر چکی تھی، جو نہ رہا جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے۔"

(علامہ اقبال اور ایک طوائف)

"یہ بہار کی بات پٹنہ کی ہے، جہاں سے چھ روزنامے اور پینتالیس ہفتہ وار اخبار اور متعدد ماہنامہ رسائل نکلتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر جوتوں اور چپلوں پر سوار فرش رہتے ہیں، جہاں بڑے بڑے علمی جرنلسٹوں کے قلمی آپریشن پر عملی تجاویز کا خاکہ صرف اس لیے تیار کیا جاتا ہے کہ کہیں فرش نشین ایڈیٹر کا ہاتھ عملی کل نہ اختیار کر لے۔"

(کرکٹ کا پہاڑ)

جب کہ روزنامہ "سنگم" پٹنہ کی بے باکانہ صحافت کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

اگرچہ اردو صحافت ہے انحطاط پذیر
مگر ہے شکر کہ 'سنگم' کا ہے مقام اب بھی
ہے اس کے ذہن میں اب بھی تمیز باطل و حق
مئے حرام ہے اس کے لیے حرام اب بھی
رواں دواں ہیں مضامین غلام سرور کے
کہیں قلم نہ ہوا اسپ بے لگام اب بھی

ہر ایک مضموں میں 'سنگم' کے تیر و نشتر ہے
مذاق اس کا ہے آئینہ عوام اب بھی
حسد سے جل اٹھا ہر بے ہنر صحافت کار
کہ اس کے گرد ہے پبلک کا اژدہام اب بھی
عوام کہتے ہیں 'سنگم' ہے مرغ آزادی
نہیں یہ طائر زیرک اسیر دام اب بھی

(ج) تصوف

اردو کی ابتدائی نشو و نما صوفیائے کرام کی رہین منت ہے۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی خانقاہ ہو جہاں اس کی اپنی لائبریری نہ ہو یا نہ رہی ہو۔ ایک زمانہ تک اس میں بے شمار نوادرات و تبرکات کے علاوہ مختلف علوم پر نایاب قلمی نسخے اور مخطوطات تھے جن کی بدولت کئی محققین اپنا مقالہ عالیہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند سے سرفراز ہوئے اور بعض نے دنیائے تحقیق و ادب میں ممتاز و نمایاں مقام حاصل کیا۔ خانقاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ تحریر و تصنیف کا بھی ایک اہم مرکز رہی ہیں، جن کی مطبوعات آج بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور بطور حوالہ ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فی زمانہ یہ ذوق نہیں رہا، کاشکار بے توجہی بالکل ختم ہو گیا۔ البتہ اس ذریعہ سے میں اجالے کی چند کرنیں اب بھی باقی ہیں۔

جن علماء نے واقف کو ان کی زندگی کے آخری دور میں دیکھا ہوگا، انہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک درویش صفت انسان اور زاہد کی طرح نظر آتے ہوں گے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم شروع سے ہی مذہبی نہج پر ہوئی۔ فقہ میں سند یافتہ ہونے کے ساتھ عصری علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ دینی کتابوں کے علاوہ قرآن و احادیث اور فقہ و تفسیر پر ان کا سیر حاصل مطالعہ تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں قرآن کی شاید ہی کوئی ایسی تفسیر ہوگی، جو ان کی نگاہوں سے نہ گزری ہو۔ انہوں نے خود سورۃ العصر کی تفسیر لکھی تو علامہ ابن قیم، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحمید فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالحق حقانی سے لے کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تک کی تفسیر و تفہیم کا حوالہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حیثیت کبھی مدرس، مفسر قرآن، یا خطیب و امام کی نہیں رہی۔ ان کی قرآن فہمی کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا سید شاہ اسماعیل روحی نے کہا تھا

"قرآن ان کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکا، انہوں نے باقاعدہ قرآن پر کوئی کام بھی نہیں کیا، لیکن قرآن کی آیات اور ان کا پس منظر ان کے حافظے میں ہے اور ضرورت کے مطابق وہ اسے نکال لیتے ہیں"۔

واقف نے تصوف کا بغائر مطالعہ کیا تھا، جس کا ماخذ قرآن واحادیث تھا، اسی لیے وہ اس راہ پر کسی اشکال کا شکار ہوئے بغیر آسانی سے چل پڑے۔ وہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف اور ان کے افکار وخیالات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ تصوف ان کے نزدیک شریعت کا حصہ تھی۔ اس کے اصطلاحات مثلاً علم لدنی، علم ویقین، معرفت وطریقت وغیرہ کو وہ عین اسلام قرار دیتے اور اس پر انگشت نمائی کرنے والوں کو دندان شکن جواب دیتے ہیں

گالیاں دے کے تصوف کو ہوئے تم عریاں
کتنے ننگے ہو ذرا اپنا سراپا دیکھو

ان کے ذہن میں تصوف کا واضح مفہوم تھا۔ وہ اس امر کے بھی معترف تھے کہ جس طرح اسلام میں مختلف خرافات کی آمیزش نے اس میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے، اسی طرح تصوف بھی ان سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ شاید اسی احساس نے ان سے "صحیح العقیدہ صوفی مشرب نوجوانوں کا ترانہ حیات" جیسی نظم لکھوائی۔

لوح محفوظ ہیں، قرآن کی تفسیر ہیں ہم
قسمتیں جس سے لرزتی ہوں وہ تقدیر ہیں ہم
زندگی مقصدِ معمارِ حرم رکھتی ہے
سنگ بنیاد ہیں ہم، قوم کی تعمیر ہیں ہم
اپنی ہر سانس میں ہے نغمہ وحدت کی صدا
روز و شب، صبح و مسا نعرۂ تکبیر ہیں ہم
نالۂ نیم شبی ہو کہ فغانِ سحری
آہ جس قلب کی ہو، آہ کی تاثیر ہیں ہم
شام غم گیسوئے والعصر میں لیتی ہے پناہ
وقت کے پاؤں میں پڑتی ہوئی زنجیر ہیں ہم

صبح ماضی کی تجلی ہے نمایاں ہم سے
خواب مستقبل اسلاف کی تعبیر ہیں ہم
لشکر صوفیت اپنا ہے صف آرائے حیات
عکس آئینہ دل جوہر شمشیر ہیں ہم
کیوں بدل جائیں زمانہ کی طرح اے واقف
جو زمانہ کو بدلتی ہے وہ تدبیر ہیں ہم

واقف کے اس ترانہ میں قرآن کا عملی صوفی نوجوان، اس کا تصور وحدانیت، اس کی روحانیت، اس کا شیوہ فقر و تنبیہ، اس کی تابندہ شخصیت اور اس کے ذہن میں سورۃ الفاتحہ کا انشراح، اس کے عزائم، اس کی تدبیر ہیں ـــــ غرض یہ تمام محرکات مل کر ایک صحیح العقیدہ صوفی مشرب نوجوان کا تصور پیش کرتا ہے، جو تصوف کی معرفت اور دین کا داعی ہے۔ یہ نظم فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے واقف کی شاہکار نظموں میں ہے، جس میں یہ دو مذہب وحدانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ نظم معنی آفرینی اور فکر انگیزی کی بھی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں تصوف و دین سے ایک نئی فکر اور عقیدہ پیش کیا ہے جو وہ اسی تصوف کے قائل ہیں جو اسلام کے بنیادی ارکان میں شامل ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں

کبھی قرآں سے تصوف ہو الگ ناممکن
کھول کر آنکھ مگر حیرت موسیٰ دیکھو

پیام عمل ہے یہی ہر ولی کا
عبادت خدا کی ، اطاعت نبیؐ کی

مریدی لاتخف تفسیر لاخوف علیہم ہے
نظر کیوں جانب آیات قرآنی نہیں جاتی

حضور قلب جو شرط صلوٰۃ مومن ہے
کہاں ملے جو نہ ہوں دل کے پاسباں مخدوم

انہوں نے اپنے صوفیانہ افکار و خیالات سے یہ نظم منشور و وحدانیت کا اظہار کیا ہے

انہوں نے شاعری کے علاوہ اپنے مضامین میں تصوف سے متعلق اپنے عقائد و نظریات کی ترجمانی کی ہے۔ یہاں صرف دو حوالے دیکھے جا سکتے ہیں۔

واقف نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''مکتوباتِ صدی'' کے ۳۳ ویں خط کا فارسی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے، جس کی غرض و غایت انہوں نے یہ بتائی ہے کہ:

''اس مکتوب کا ترجمہ خود راقم الحروف کو کرنا پڑا، کیوں کہ دوسرے تراجم اضافہ و ترمیم معنوی سے معمور نظر آتے ہیں''۔

وہ ''مکتوبات صدی'' کی افادیت و اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج مراسلات کے ذریعہ ساری دنیا میں تعلیم کا رواج ہے۔ امریکہ، یورپ میں بڑی بڑی مواصلاتی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔''

''الہامات منعمی'' حضرت مخدوم شاہ منعم پاک قدس سرہ العزیز کی فارسی میں لکھی تصوف پر ایک نادر تصنیف ہے۔ جس کی ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ﴾ کی شرح کی تشریح واقف یوں کرتے ہیں

''شرح عند الصوفیہ خیالات، جذبات، افکار و بھی اعمال کی حیثیت حاصل ہے؛ اس لیے اس آیت پاک سے استدلال فرمایا کہ جو ذرا سا خیر کرے گا، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور جو ذرا سی شر کرے گا اس کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ علمائے ظاہر اس آیت پاک کی تفسیر انجام اور نتیجہ سے کرتے آئے ہیں، یعنی اچھے اور برے اعمال کے نتائج اور انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، مگر صوفیائے کرام یعنی علمائے علم احسان اس کی وہی تفسیر کرتے ہیں، جو حضرت سیدنا مخدوم منعم پاک قدس سرہ نے فرمائی۔

عزیز من! اے میرے عزیز! ہر شخص کی جنت اور دوزخ کی وسعت اس کے اعمال اور عرفان کے پھیلاؤ کے مطابق ہے۔

شرح یعنی جس کی معرفت قرآن، معرفت رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم معرفت ذات و صفات و افعال خداوند عز اسمہ جل جلالہ معرفت قرآن حکیم، معرفت احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم، معرفت صلوۃ، معرفت تسبیح، معرفت تحمید، معرفت تہلیل، معرفت اطاعت

نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، معرفت اطاعت ولی الامر یعنی معرفت ائمہ دین ومشائخ طریقت جتنی وسیع ہوگی، اس کی جنت بھی اسی وسعت کے تناسب سے وسیع ہوگی۔ معرفت منکرات ومعاصی، معرفت کبر وغرور، معرفت رشک وحسد، معرفت بغض وعناد، معرفت کفر وشرک، معرفت اتباع خطوات الشیطان جتنی وسیع ہوگی۔ اعاذنا باللہ"۔

"علم" کسی چیز کو جاننا ہے۔ آپ نے تاج محل آگرہ نہیں دیکھا، مگر کتابوں میں پڑھا، بہ کثرت لوگوں سے سنا، اس تواتر کے ساتھ سنا کہ دل میں کیفیت یقین پیدا ہوگئی۔ اس کا نام "علم الیقین" ہے اور یقین کہتے ہیں اس کیفیت کو جو کسی مشکک کے شک دلانے سے زائل نہ ہو۔

اس سے اونچا مرتبہ ہے "عین الیقین"۔ ذہن میں تاج محل کے جو خاکے بنائے تھے مٹ گئے، اب صحیح تصور ذہن میں تاج محل کا پیدا ہوگیا، اس کو "عین الیقین" کہتے ہیں۔

اچھا آپ آگرہ پہنچے، آپ نے اپنی آنکھوں سے تاج محل کو دیکھ لیا۔ اس مرتبہ "عین الیقین" کا تصور دیکھ کر جو تصور پیدا ہوا تھا بالکل بدل گیا۔ یہی مرتبہ "حق الیقین" ہے۔ اسی کا دوسرا نام عند الصوفیہ معرفت ہے۔ خلاصہ یہ کہ گناہگار آدمی سے اس آخری مرتبہ پر پہنچ گئے یا ہوس کی معلومات شیطان کی دعوتوں کا کیا پوچھنا کہ اس کی یہی عملی معلومات معرفت کی معلومات بن جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنی چاہیے"۔

(ماہنامہ معارف پٹنہ، ستمبر ۱۹۸۰ء، ص ۸۰۹)

تصوف پر ہی واقف اپنے ایک تنقیدی، تجزیاتی مضمون "تلبیس ابلیس تجدید دین کی نظر میں" میں مولانا وحید الدین خاں کی کتاب "تلبیس ابلیس" کے صفحہ سولہ کا حوالہ دیتے ہیں، جس کا ایک مختصر اقتباس درج ذیل ہے:

"اس سلسلے میں دوسری چیز وہ ہے جس کو تصوف کہتے ہیں۔ پہلا شخص جس کو اسلامی تاریخ میں صوفی کے لفظ سے پکارا گیا وہ ابو ہاشم صوفی (۱۵۰ھ) تھے۔ تاہم اس وقت تک صوفی کے معنی صرف یہ تھے کہ شخص جو عبادت میں غلو کرے، یہاں تک کہ پرانے اونی کپڑے پہنے جس کو صوف (اون) کے معنی پڑتے ہیں۔ پھر صوفی کہلاتے تھے۔ اس کے بعد اس کے متعدد اصطلاحی معنی بننے لگے، یہاں تک کہ تیسری صدی

ہجری میں پہنچ کر تصوف نے اسلامی روحانیت کے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر لی۔ شرقی فلسفہ رہبانیت اور ویدانت میں اس کے لیے کافی مواد تھا۔ اس طرح مختلف بیرونی عناصر کی مدد سے ایک ایسی چیز وجود میں آئی، جس پر اگرچہ اسلام کا لیبل لگا ہوا تھا، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک متوازی مذہب تھا، جو سوم کے اندر اسلام کے بالمقابل بنایا گیا"۔

مذکورہ اقتباس پر واقف کا تجزیاتی و تنقیدی جائزہ ملاحظہ فرمائیں

"مولانا وحید الدین خاں کی کور چشمی اور دیدہ دلیری اسلام کے سب سے پہلے صوفی کو بھی نہیں پہچانتی، مگر جن کے دلوں کو اللہ نے ایمان کی روشنی عطا فرمائی، وہ قرآن کے اوراق میں اسلام کے سب سے پہلے صوفی کو دیکھتے ہیں اور بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

یہ مزمل صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ کملی والے نہیں ہوتی تو کس چیز سے بنتی؟ سورہ مزمل شریف اسلام کی درویشی کا مکمل ہدایت نامہ ہے کہ دنیا سے اور تصوف کی ساری کتابیں بھی خدانخواستہ ناپید ہو جائیں تو سورہ مزمل شریف درویشوں کے لیے اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات میں کافی ہیں، واصبر ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا ۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بیہودگیاں آپ کو کہتے ہیں اس پر صبر فرمائیے اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے علیحدہ ہو جائیے۔ یہ ہے ہمارے صوفی کا عمل اس پر رہا اور آج بھی جہاں حقیقی صوفی موجود ہیں، اس پر عمل پیرا ہیں۔ کملی والے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی کملی کو جن بزرگوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، انہیں قرآن ۔ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ کہہ رہا ہے۔ بہ نیت اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ جانے والے اللہ کے محبوب ہیں۔ خدا کہہ رہا ہے، جل جلالہ وعمنوالہ، مگر عقل و ایمان کے اندھوں کو نہیں سوجھتا۔

مولانا وحید الدین نے اشراقی فلسفہ کا صرف نام سنا ہے، اس کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیوں نے فلسفہ اشراق کو مردود قرار دیا اور شیخ اشراق شہاب الدین کو مقتول کہا جاتا ہے، انہیں کوئی صوفی یا عالم اہل سنت والجماعت شہید بننے کو بھی تیار نہیں ہے اور مولانا وحید الدین خاں کے مورث اعلیٰ ۔ ثم استوی علی العرش ۔ کی آیت سے خدا کی جسمانیت کے قائل ہوئے اور اسلام میں فرقہ مجسمیہ کی بنیاد رکھی، جو اشراقیت اور رہبانیت اور ویدانت سے بھی زیادہ گمراہ کن ہے تو انہیں صوفی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ذرا ہوش و حواس سے کام لینا چاہیے تھا۔

کہاں کی رہبانیت؟ کیسی رہبانیت! شرح عقائد نسفی میں ساری دنیا کے اہل سنت والجماعت یہ پڑھتے اور پڑھاتے آئے کہ نحن نعتقد علی طریق الجنید واصحابہ طریق مستقیم (ہم اہل سنت والجماعت یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ جنید بغدادی اور ان کے اصحاب کا طریقہ قرآن وسنت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے)۔

کیا مولانا وحید الدین خاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی رحمہما اللہ علیہم راہب تھے، گمراہ تھے، کوئی متوازی اسلام لے کر چل رہے تھے۔ فلسفہ اشراق اور ویدانت فلسفی کی صدائے بازگشت تھے، اپنے بیان کی توسیع کرتے ہوئے واقف آگے لکھتے ہیں

"علم حدیث کی طرح علم طریقت بھی روایت بسند متصل امت تک پہنچا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب وغیرہ وہابی طریقت پر حملے سے پہلے محدثین کرام کی روایتوں کے حصار کو مدنظر رکھنا چاہیے تھا۔ روایتوں اور اسناد پر جرح وتنقید کا جو معیار بھی وہ مقرر فرمائیں صوفیائے کرام کے طریقت اس معیار پر پورے اتریں گے اور محدثین کرام، جنہیں خاں صاحب نے پڑھا تو ہے سمجھا بالکل نہیں، ابھی اسماء الرجال کی بحث وجرح سے بھی آزاد نہ ہوئے۔ غالباً مولانا وحید الدین خاں اس کو پسند نہیں فرمائیں گے کہ محدثین کے خلاف مولانا تمنا عمادی کی بیجا روی کی خرافات کو شائع کر دیا جائے اور اس کے اصول کو مدنظر رکھنے کا آغاز ہو جائے، آپ علم لدنی کو احادیث نبویہ سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور صوفیائے کرام پر خود غرض کے تیروں کی بوچھار کرتے ہوئے وہ سب بھول جاتے ہیں [illegible] ذرا اعادہ ہنگامی کر دیکھیے

"وعلمناہ من لدنا علما" قرآن کی یہ آیت آیت ہے یا نہیں؟ علم لدنی قرآن کا ایک حصہ ہے، جو حضور سید انبیاء المرسلین کو عطا کیا گیا۔

ویعلمہم الکتاب والحکمۃ میں حکمت سے یہی علم لدنی مراد ہے، جس کی تعلیم سند بہ سند صوفیائے کرام میں چلی آتی ہے۔ اس علم میں فقہ کی طرح اجتہادات بھی ہوئے اور ہر مسند اپنے مجتہد طریقت کے نام سے منسوب اور مشہور ہوا۔"

(ماہنامہ اعلم پٹنہ، بابت ۸۹، جنوری ۱۹۸۰ء ص ۲۳ تا ۲۵)

مندرجہ بالا اشارات سے واقف کا تصوف کے سلسلہ میں عقیدہ اور مطالعہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

واقف: ایک اجمالی جائزہ

مختلف علوم وفنون پر کمال رکھنے والے صاحب طرز شاعر اور انشا پرداز علامہ سید شاہ فضل امام واقف جیسے نابغہ روزگار برسوں نہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عالی نسب تھے اور نجیب الطرفین سید تھے۔ گلابی رنگت، بارعب آنکھیں، پرنور چہرہ، پاٹ دار آواز ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی تھیں۔ ان کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کے اس ذی علم اور متمول گھرانے سے تھا، جو ہر اعتبار سے آج بھی معروف وممتاز ہے۔ اگرچہ واقف کی علمی وادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں، مگر ستم ظریفیٔ زمانہ کہ ان کی غیر معمولی فتوحات جب تک وہ مرتبہ ومقام نہیں مل سکا، جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کی طبعی بے نیازی اور خود فراموشی کا بھی اس میں کسی حد تک دخل ہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی وسماجی، یا شعری وادبی حیثیت منوانے کے لیے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ انھیں شہرت وناموری کبھی پسند نہیں تھی، جب کہ حقیقت ہے کہ وہ تمام اوصاف سے حامل اور مختلف اصناف نثر ونظم پر کمال رکھنے والے فنکار تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو شعری وادبی ترکہ چھوڑا ہے، وہ ہمارے ادب کا قیمتی ورثہ ہے۔ میرے علم کے مطابق ان کی حیات وخدمات کے حوالے سے اب تک کوئی جامع کتاب منظر عام پر آئی ہے، نہ کوئی قابل ذکر تحقیقی کام ہوا ہے؛ (صرف ایک مقالہ علیمہ بہار یونیورسٹی میں جمع ہوا تھا، جس پر ڈاکٹریٹ کی سند عطا ہوئی ہے) تاہم ان کی تخلیقی خدمات جس کا بہت بڑا حصہ 'واقف آرٹ'، 'طنز وتغزل'، 'حالات حاضرہ' پر منظوم تبصرہ اور دیگر مضامین پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ 'کارشات واقف' کے ہزاروں صفحات وہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جو ان کی شہرت اور بقائے دوام کی ضمانت ہے۔

جہاں تک واقف کی کلاسیکی شاعری کا تعلق ہے، جا طور پر انھوں نے خود کو اقبال، جگر، سیماب، صاحب وغیرہ کی صفوں میں شمار کیا ہے۔ ان کا کلام ان کے اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے، البتہ 'طنز وتغزل' اور 'واقف آرٹ' میں ان کی حیثیت موجد، مجتہد اور خاتم کی ہے۔

ہجو نگاری ان کا پسندیدہ موضوع رہا، جس سے انہوں نے بڑا کام لیا، ان کی اس نوع کی شاعری نے جہاں وقت کی رفتار پر قدغن لگایا، وہیں اپنے عہد پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ اہل سخن نے ان کے کمال سخن کی پذیرائی اور ذہن رسا کی ستائش کی ہے۔

واقف کی شاعری میں جا بجا عوامی بہبود اور انسان دوستی کا جذبہ موجزن ہے، لیکن یہ ان کے فن اور سماجی شعور پر کبھی غالب نہیں آسکا، انہیں اپنے موضوع سے گہری وابستگی اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے شہر آرا میں ایک محلہ کا نام 'تری' ہے۔ وہاں کے ایک شاعر نے کسی مشاعرہ میں جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا:

ذرا اے ناخدائے عشق میری رہبری کرنا
ہجوم یاس میں واماندگی محسوس ہوتی ہے

تو شاعر کے محلہ 'تری' کی مناسبت سے 'محسوس ہوتی' ہے اور 'معلوم ہوتی' ہے کے باریک فرق کو واقف نے جس برجستگی سے اپنے دو اشعار میں واضح کیا اور شاعر کی زبان دانی کو جس لطیف انداز میں ہدف بنایا، وہ انہیں جیسے سخن شناس کا حصہ ہے۔ شعر دیکھئے

یہی اک بات ہے جو اس گھڑی محسوس ہوتی ہے
کہ خامی حاصل صد پختگی محسوس ہوتی ہے
'تری' میں رہنما اور ناخدا خشکی میں کیا کہنا
مجھے واماندگی پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہے

ان کی اس طرح کی مثالوں سے مشاعروں کی یادیں اور شعری گلدستے بھرے پڑے ہیں، بعض کے عینی شواہد ابھی بھی موجود ہیں۔

واقف کی شاعری کا ایک اہم موڑ 'واقف آرٹ' ہے، جو اردو اخباروں کے صفحات کی ایک عرصہ تک شان بڑھاتا رہا۔ یہ ان کے پختہ سیاسی، سماجی شعور اور زندگی کے آلام و مصائب کا اشاریہ ہے۔ 'واقف آرٹ' ایک مدت تک علمی، ادبی حلقے میں مقبول اور ذہنوں کو مہمیز کرتا رہا۔ یہاں تک کہ برسہا برس حکمراں طبقہ بھی اس سے متاثر رہا۔ حزب مخالف کے لیے تو یہ مخصوص اور کارآمد نسخہ تھا ہی، انفرادی طور پر بھی دوستوں کو 'واقف آرٹ' کے تحت منظوم کلامی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اس

کی مدد سے ہندوستان کے پچاس سالہ ادبی وشعری، سیاسی وسماجی نشیب وفراز کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس آرٹ نے انہیں معاشی طور پر بھی سہارا دیا اور ان کی مقبولیت کا سبب بھی ہوا۔ 'واقف آرٹ' سے صرف چند اشعار پیش ہیں:

مجھے بتائیں گے عزت مآب انصاری
خرد جنوں سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نسیم صبح وزارت ہے آج خواب آور
کہیں نصیب کو نیند آگئی تو کیا ہوگا
میں جانتا ہوں کہ گیسوئے یار پرخم ہے
خودی کی زلف بھی لہرا گئی تو کیا ہوگا
نہ سوچئے کہ قیامت بھی آنے والی ہے
یہ سوچئے کہ اگر آگئی تو کیا ہوگا

طبیعت بادہ نوشوں کی جواں معلوم ہوتی ہے
عطا کچھ آپ کی پیر مغاں معلوم ہوتی ہے
اگر گم کردہ راہ گلستاں معلوم ہوتی ہے
نسیم صبح کی آمد گراں معلوم ہوتی ہے
محبت کی کسک دل سے ابھر آئی ہے آنکھوں میں
نہاں محسوس ہوتی تھی عیاں معلوم ہوتی ہے
کوئی آواز ہو کوئی صدا ہو کوئی نغمہ ہو
ہمارے کعبۂ دل کی اذاں معلوم ہوتی ہے
شکایت ہے کسی کی شوخیٔ تحریر کی واقف
تری تصویر نقش رائیگاں معلوم ہوتی ہے

واقف آرٹ کی تمام خوبیوں کے علاوہ اس کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ اس کی روشنی کی چکاچوندھ کے سامنے واقف کی سخنوری کے دوسرے انتہائی روشن باب ماند پڑ گئے، یہاں تک کہ ہماری نئی نسل تو کجا واقف کے معاصرین کی اکثریت کی نگاہیں بھی صنفِ غزل اور واقف آرٹ سے اوپر نہیں اٹھتیں، جس کے سبب اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے دوسرے جواہر پارے کہیں پردۂ خفا میں نہ چلے جائیں۔ ان خدشات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اگر بہت جلد باقیاتِ واقف کی ترتیب و تدوین نہیں کی گئی تو ان کی کلاسیکی شاعری اور نثر نگاری کے ساتھ دیگر بیش قیمت نگارشات بھی معدوم ہو سکتی ہیں۔ اس طرح واقف کے ساتھ انصاف تو درکنار اپنی ادبی وراثت کا گلا گھونٹنے کے جرم کے مرتکب بھی ہوں گے۔

واقف کی کلاسیکی غزلیں اور پیچیدہ نظمیں فنی و فکری اعتبار سے انتہائی بلند درجات کی حامل ہیں۔ ان میں بعض ملکی و غیر ملکی صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں جن سے بار بار رجوع کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے کئی شاعری ندرت سخن اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ معیاری اور تجربی شعر میں ان کے حسن تخیل کی جھلک، شعر و نثر کا موازنہ کا مطالعہ اس میں مختلف صنعتوں، مضامین، تلمیحات اور اشارے کا کمال ہے۔

واقف کے یہاں وجدانیت میں ڈوبا ہوا ذکر مذہب رسول کے سرشار عقیدت، عقیدت محبت کے جذبات سے بھرپور مدحت، مرثیہ کے اور ایسے سرامہ بزرگان دین کی شان میں کہے گئے قصائد ان کے جوش ایمانی، عقیدت قلبی اور ان کی سماجی بصیرت کا نتیجہ ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سرمایہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے قبل یہ ادبی سرمایہ آثار قدیمہ کے ذیل میں آ جائے، اس قیمتی اثاثے کی بازیافت اور ان کی تدوین و ترتیب ہی وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔

واقف کے معتقدین و معاصرین میں متعدد قابل قدر شعرا ایسے گزرے ہیں جن کی شاعری خدمات بھی وقیع ہیں مگر واقف نے اپنی نثری تصنیفات کا بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے۔ اس سے علم و ادب کا ایک بڑا حلقہ واقف ہے۔ ان میں بعض واقف کے فکری و عملی کارنامے ہیں، بعض اخبار تک محدود رہے، ابھی تک نگارشات واقف دستیاب ہیں جن میں علم و ادب، شعر و سخن، تاریخ و سیاست اور سماجیات کی نظریاتی آ گئی ہیں۔ یہ تمام تحقیق، تنقید، تاثر، تجزیہ، تہذیب، تمدن، سیاست،

سوانح، سیاست، شخصیت، ملک، مذہب، ملت، ادب، صحافت ـــــ غرض ایسا سرچشمہ ہے، جس کے بے شمار سوتے 'نگارشاتِ واقف' میں پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، پھر انہوں نے خالص تنقیدی مضامین بھی لکھے، جس میں انہوں نے عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ کلام کے حسن و قبح اور ان کے عیوب و محاسن پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں

''بہترین شعر وہ نہیں، جو فلسفہ ہو، بلکہ بہترین شعر وہ ہے، جو دعوتِ فکر ہو، جو اتنا خیال انگیز ہو کہ ذہن کے سانچے خود بخود بدل جائیں''۔

''جو شعرائے کرام کسی ایک صنفِ سخن، یا دو چار اصنافِ سخن میں محدود رہے، انہیں شاعر کہنا تکلف سے خالی نہیں ہے۔''

واقف کی نثر کے یہ وہ انمول جواہر ہیں، جن سے بحث کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ انہوں نے کوچۂ تصوف میں بھی قدم رکھا اور اس باب میں بھی اپنی شاعری اور نثر پر مشتمل قیمتی سرمایہ چھوڑا، لیکن یہ بھی منتشر ہیں۔

واقف کی شخصیت، ان کا شاندار ماضی اور دردناک مستقبل، ان کی شاعری کی مختلف جہات اور مختلف النوع نثری تحریریں تفصیلی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں، اگرچہ ان پر چند کتابیں اور تقریباً نصف درجن مضامین شائع ہو چکے ہیں، لیکن ابھی بھی ان کی شخصیت اور فکر و فن کے تعین کا کام ابتدائی مرحلہ میں معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے طنز و ظرافت کے تعلق سے میر، غالب، سودا، حالی، اکبر اور اقبال وغیرہ کے کلام کا جس طرح جائزہ لیا ہے اور اپنی بے باکانہ رائے دی ہے، اس سے ان کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک صحافی کی حیثیت سے واقف کی خدمات اور حالاتِ حاضرہ پر ان کا جرأت مندانہ نثری و شعری اظہار کی جادوگری نے ان کے قارئین کو شاید اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ ان کے دوسرے اصناف پر بھی توجہ دیتے۔ یہی ان کے مرتبہ و مقام کے تعین میں بہت حد تک رخنہ کا سبب بھی ہے۔ بیک وقت وہ اتنے سارے موضوعات اور اصناف پر لکھتے رہے کہ ان کے قارئین کے لیے یہ انتخاب مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا کہ ان کی ترجیحات کیا ہوں؟ پھر ان کی فقیرانہ زندگی، درویشانہ انداز، قلندرانہ زیست، خلافِ معمول عادتیں بھی ایک زمانہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں اور برسہا برس یہی عوامل ان کے تعلق سے موضوعِ بحث رہے۔ کوئلے کی راکھ سے ان کا شغل، دنیا سے بے نیازی اور

اپنے حال میں مست رہ کر انہوں نے یہ دکھلا دیا کہ صرف اللہ کے بھروسے کیسے جیا جا سکتا ہے، وہ بھی جس کا ماضی انتہائی شاندار، بلکہ شاہانہ رہا۔ وہ مجلسی آدمی تھے، خود میں ایک انجمن تھے، جہاں صاحب اقتدار طبقات سے ان کے روابط تھے، وہیں صحافت، ادب اور شعر و سخن کے نامور لوگوں سے بھی ان کے دیرینہ تعلقات رہے ——— غرض واقف کی نفسیات اور شخصیت کے نوع بہ نوع پہلو، ان کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کا علم و آگہی، ان کی سیاسی و سماجی بصیرت سے لے کر ان کی تنہائیوں کے شب و روز ایسے پہلو ہیں، جنہیں مطالعے کے دائرے میں سمیٹنا اور تحریر میں لانا ایک مشکل مرحلہ ہے، لیکن انہیں ضبط تحریر میں لانا وقت کا اہم تقاضہ ہے، کیوں کہ مزاج کی تندی، ترشی سے باوجود پچاس ساٹھ سال تک ان کی شخصیت لوگوں کے لیے کشش اور توجہ کا باعث رہی۔

لوگ واقف سے بڑی محبت کرتے تھے، لیکن اس محبت کے تقاضے کا حق اسی وقت ادا ہوگا جب کلیات واقف کی تدوین اور ان کی بکھری اور پھیلی ہوئی نثری تحریروں کی ترتیب کا جو کام اٹھائے گا کام سرانجام دیا جائے، مگر سوال ہے یہ کام کرے کون؟

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

انتخاب کلام

غزلیں

[۱]

پڑھو اس کو تمہارے واسطے کیا کیا لکھا میں نے
کتاب دل لکھی ، اک دفتر معنی لکھا میں نے

رعایت لفظ و معنی کی نہ ہو تو شعر مہمل ہے
وہاں ساحل بھی دیکھو ہے جہاں دریا لکھا میں نے

مرے اشعار میں منظر کشی بھی ہے ظرافت بھی
قلم نے کھینچ دی تصویر جو خاکا لکھا میں نے

ہر اک برنگ نایک پر لکھا میرے سوا کس نے؟
جو لکھا وہ بہ رنگ آتش صحرا لکھا میں نے

زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی
مزا آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے

شگفتہ طبع ہوں ہر رنگ ہے باغ و بہار اپنا
ہر اک مضمون خار و گل تر و تازہ لکھا میں نے

مرے اشعار میں ہے جابجا آہنگ صاحب بھی
دلیل اس کی وہیں لکھ دی جہاں دعویٰ لکھا میں نے

مرے اشعار میں ہے بلبل شیراز کا نغمہ
بہت رنگیں لکھا لیکن بہت سادہ لکھا میں نے

مخالف میرے کہتے ہیں کہ میں ہذیان و یاوہ ہوں
اسے سفلہ لکھا میں نے اسے خفتہ لکھا میں نے

حقیقت اس میں صرف اتنی ہے اے وسوسہ تو
جو بے ہودہ تھا اس کو ذکی و بے ہودہ لکھا میں نے

مگر جو لوگ اچھے ہیں بڑھایا حوصلہ ان کا

بانگ صور اسرافیل انہیں اچھا لکھا میں نے
وہیں 'ماضی' سے جوڑا ذہن کا ٹوٹا ہوا رشتہ
اگر 'امروز' کو وابستہ 'فردا' لکھا میں نے
مدد مانگی خدا سے اور ہر مضمون کو واقف
قلم برداشتہ لکھتا ہوں برجستہ لکھا میں نے

[۲]

ہے 'مین از اے مسٹری' کا مسئلہ نہ پوچھئے
جو ہو رہا ہے دیکھئے جو ہو گیا نہ پوچھئے
ہر ایک چیز ہے گراں مگر زبان یار پر
کہاں پہ اس کا نام ہے کہاں پتہ نہ پوچھئے
'مسائل حیات' سے گریز ہر سخن میں ہے
'وزیر ہے تبات' کا یہ ماجرا نہ پوچھئے
ہے 'آر ایس ایس' آج بھی 'قدم قدم بڑھے چلو'
کہاں سے اس کے دل میں ہے یہ حوصلہ نہ پوچھئے
'شکست خوردہ ذہنیت' کا ایک 'نمونہ' ملا
کہا کہ کچھ بتایئے! وہ بول اٹھا نہ پوچھئے
یہ روس ہے، وہ امریکہ، یہ میں ہوں اور وہ آپ ہیں
ہے کون کس کی 'دم' میں اب بندھا ہوا نہ پوچھئے
تنازع لبنان کا حل فضائے شیطنت میں ہے
لڑو، بھڑو، کٹو، مرو کا فلسفہ نہ پوچھئے
کھڑے ہوئے ہیں قبلہ رخ امام و مقتدی مگر
ہے دو دلوں کے درمیاں جو فاصلہ نہ پوچھئے
ملی جلی حقیقتوں کا نام 'واقف آرٹ' ہے
الگ الگ نہ پوچھئے جدا جدا نہ پوچھئے

[۳]

یہ کوشش تھی کہ سعی رائیگاں اچھی سے اچھی ہو
اڑے لیکن یہ گرد کارواں اچھی سے اچھی ہو

میاں مجنوں تھرکتے ہیں کہ ہے محمل نشیں لیلیٰ
حدی خوانی ذرا اے ساربان اچھی سے اچھی ہو

کہا اک نیچری نے کل کہ نیچر کا تقاضہ ہے
بہار اچھی سے اچھی ہو خزاں اچھی سے اچھی ہو

کہا کچھمن نے میں بنیا ہوں سچی بات کہتا ہوں
کہ مٹی بیچ دوں لیکن دکاں اچھی سے اچھی ہو

اسی مجلس میں اک شاعر بھی تھے کہنے لگے مجھ سے
کہ مضموں کچھ بھی ہو حضرت زباں اچھی سے اچھی ہو

وہیں پر اک نمازی تھے وہ بولے سب نمازی ہوں
جو ہو روح بلالی اور اذاں اچھی سے اچھی ہو

بقول حضرت رومی ہے ستر دلبراں خوشتر
مگر دیکھو حدیث دیگراں اچھی سے اچھی ہو

کہا تھا مرنے والوں نے سنا تھا جینے والوں نے
تن خاکی میں جان ناتواں اچھی سے اچھی ہو

ہے سارے کاروبار انسانی سارا کاسے سارا کا ہنگامہ
کہ تکمیل مذاق شاعراں اچھی سے اچھی ہو

ہمیشہ ہر سیاسی پارٹی کو فکر رہتی ہے
کہ اخباروں میں اس کی داستاں اچھی سے اچھی ہو

سنا ہے شیخ عبداللہ تھے اقبال کشمیری
خودی حق ہے نشت زعفراں اچھی سے اچھی ہو

[۴]

ہندو نظر آئے نہ مسلماں نظر آیا
ہر کفر یہاں حاصل ایماں نظر آیا

ہر زلف یہاں زلف پریشاں نظر آئی
ہر خواب یہاں خواب پریشاں نظر آیا

کرنے لگا مجھ سے 'سیکولرازم' کی باتیں
اچھا مجھے وہ تاحد امکاں نظر آیا

جو ہوش میں تھے ان کو تھی ہر راہ میں مشکل
مستوں کو ہر اک راستہ آسان نظر آیا
تیرے 'اسٹمک اتیج' سے جب دل مرا ٹوٹا
یہ ذرۂ ناچیز بیاباں نظر آیا
اس مرد برہنہ کو بھی تنقید کی سوجھی
مجنوں کو مرا چاک گریباں نظر آیا
آجاتی ہے اخبار سے 'سپ' میں مری وسعت
مجھ کو یہ 'ٹیبل ٹاک' کا ساماں نظر آیا
بے کار ہے، لاینحل ہے دیکھ اے شب تاریک
جگنو سے جو صحرا میں چراغاں نظر آیا

[۵]

لطف ستم ہے قتل مکرر ہے واہ واہ
میرے گلے پہ آپ کا خنجر ہے واہ واہ
آئے ہیں آپ زلف پریشاں کئے ہوئے
گیسوئے انقلاب معطر ہے واہ واہ
کرتے ہیں آپ 'غول بیاباں' کی رہبری
شیطاں بھی جس کو دیکھ کے ششدر ہے واہ واہ
'مستقبل قریب' سے 'ماضی' بعید ہے
'دنیائے حال' برصف محشر ہے واہ واہ
'آئین عدل' عضو معطل ہے آج کل
لے دے کے ساری بات برابر ہے واہ واہ
ہے 'آمد بہار' میں 'آورد نو بہ نو'
باد نسیم تابع صر صر ہے واہ واہ
دیوانہ جوش میں ہے نہ فرزانہ ہوش میں
دونوں کے سر میں قلب مکرر ہے واہ واہ
'خالی تھا جام اور پئے جاتے تھے جگر'
تصویر حال وجد کا منظر ہے واہ واہ

اس کے بغیر چل نہ سکی 'گفتگو حق'
غالب ہیں اور 'بادہ و ساغر' ہے واہ واہ
واقف نئی زمین ، اچھوتی ردیف ہے
ہر شعر میں یہ دیکھئے کیوں کر ہے واہ واہ

[٦]

'غنڈوں' کو انگلیوں سے اشارہ کرے کوئی
سارا 'پلان' ان کو بتایا کرے کوئی
بجلی کی طرح 'چرخ' پہ چمکا کرے کوئی
بادل کی طرح 'جبہ' میں گرجا کرے کوئی
ساقی اگر ہو دشمن ایمان و آگہی
کم ظرفی خیال گوارا کرے کوئی
جب ہاتھ آگئی ہے سیاست کی ڈگڈگی
'بندر' کی طرح سب کو نچایا کرے کوئی
فرد حساب جرم تمنا نہ مل سکی
کیوں بار بار اس کا تقاضا کرے کوئی
ہر ایک 'ذی خیال' ہے خنجر لیے ہوئے
کس کس حرام زادے کا شکوہ کرے کوئی
دیتا ہے ملک 'دعوت نظارہ' فسادا
آنکھوں کو اپنی محو تماشا کرے کوئی
'سنگم' کی سرحدیں ہیں شہیدوں کی داستاں
'افسانۂ حیات' سنایا کرے کوئی
ترتیب 'نفس' بے مظالم ضرور ہے
فوراً پریس رپورٹ مہیا کرے کوئی
جو تو نے ان کے کانوں میں پہنچے سے کہہ دیا
اب پھر ہمیں نہ 'وعدۂ فردا' کرے کوئی
'مجنوں' کا ووٹ کیا ہے؟ ملے گا مگر یہ شرط
حاصل مقام ناقۂ لیلیٰ کرے کوئی

اکتا گئی ہے اپنی طبیعت خدا گواہ
کب تک بتوں کے سامنے سجدہ کرے کوئی
واقف زمین حضرت غالب ہے فیض بخش
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

[۷]

دوستو! گر جھوٹ کی پھنکار بڑھتی جائے گی
دیکھتے جانا 'خدا کی مار' بڑھتی جائے گی
'ٹھپہ بازی' پر ہے جب دار و مدارِ انتخاب
آپ گھٹتے جائیں گے سرکار بڑھتی جائے گی
'رشوت آباد عمل' ہے کاروبار زندگی
اور ابھی یہ گرمی بازار بڑھتی جائے گی
'اختلاط خیر و شر' غنڈوں میں گر قائم رہا
یہ خلیج کافر و دیندار بڑھتی جائے گی
ماننے کی بات کو بھی گر نہ مانے کا کوئی
بحث بڑھتی جائے گی تکرار بڑھتی جائے گی
مجرموں کی دھر پکڑ سے ہوگی گر پہلو تہی
طاقت ہر 'مردم خونخوار' بڑھتی جائے گی
کیف اندر کیف ہے یا لطف اندر لطف ہے
آپ پڑھئے! لذت اشعار بڑھتی جائے گی

[۸]

اچھی نہیں ہمیشہ حقیقت کی بات چیت
کرتے ہیں لوگ اس سے شرارت کی بات چیت
مومن ہلاک لذت افطار ہوگیا
لیکن زباں پہ اس کی ہے جنت کی بات چیت
وہ آئے جب تو بحث کا نقشہ بدل گیا
کل سے چھڑی ہوئی تھی حماقت کی بات چیت
ہر روزہ دار مفتی اسلام ہوگیا

ہر مسئلہ میں کرتا ہے جنت کی بات چیت
روزہ میں کھل کے ہوتی ہے دو مفتیوں میں جنگ
اور اس کے بعد صاف جہالت کی بات چیت
کرتے ہیں ضبط غصہ کو دونوں بہ جبر و قہر
رہ جاتی ہے ادھوری شجاعت کی بات چیت
مغرب کے بعد چھڑتی ہے پھر ٹھنڈی ٹھنڈی جنگ
ہوتی ہے سرد سرد امانت کی بات چیت
ایسے بھی خال خال ہیں جن سے اگر ملو
کرتے ہیں کچھ شگفتہ طبیعت کی بات چیت
رکھتے ہیں وہ بلندیٔ گفتار فطرتاً
شکوے کا شائبہ نہ شکایت کی بات چیت
دشمن کے نام کو بھی وہ لیتے ہیں اس طرح
اڑ جاتی ہے ہوا میں عداوت میں بات چیت
اور ایسے روزہ دار بھی ملتے ہیں صبح و شام
ہوتی ہے جن کی اس میں وحشت کی بات چیت
ذکرِ عذاب قبر زباں پر ہے رات دن
ملتے ہی چھیڑتے ہیں قیامت کی بات چیت

[۹]

اٹھا میں کر کے ترک تمنا ابھی ابھی
کرنے لگا وہ شوخ تماشا ابھی ابھی
فوجِ عدو ہوئی ہے صف آرا ابھی ابھی
بنتا ہے مجھ کو چھپ کے گوریلا ابھی ابھی
جو زخم خوردۂ ستم روزگار ہے
کرتا ہے مجھ کو اس کا مداوا ابھی ابھی
ماتم نشینِ عقل ہے مسجد میں اک 'امام'
کھا کر فریب وعدۂ 'اندرا' ابھی ابھی
لایا مرا ملازم احمق میں کیا کہوں

'آلو' کے ساتھ آلو بخارا ابھی ابھی
ہیں وہ خموشی لب ساحل بنے ہوئے
الٹی بہا چکے ہیں جو گنگا ابھی ابھی
کیا جانیں وہ کہ 'قوم کی خدمت' ہے کس کا نام
آیا ہے جن کی جیب میں پیسہ ابھی ابھی
نیچی نگاہ کرکے چلے جارہے ہیں وہ
اونچا ہوا ہے جن کا 'ترنگا' ابھی ابھی
'کاکا قوا' نے 'کانگریس آئی' سے کہہ دیا
الو ہوا ہے آپ کا سیدھا ابھی ابھی
چھیڑا تھا جس نے 'نغمہ اندرا' بہ ساز ترنج
بھگا ہے چھوڑ چھاڑ کے طبلہ ابھی ابھی

[۱۰]

لیلیٰ کرے گی زلف پریشاں ادھر ادھر
مجنوں بھی ہوگا چاک گریباں ادھر ادھر
کھاتے پھریں گے لوگ 'سویاں' ادھر ادھر
ملتے پھریں گے 'عید' مسلماں ادھر ادھر
شاعر غریب ہوں گے غزل خواں ادھر ادھر
لیڈر بھی ہوں گے قوم پہ قرباں ادھر ادھر
کرتے پھریں گے ڈنڈے تھپیڑوں کا سامنا
مارے پھریں گے 'کودک ناداں' ادھر ادھر
قطرہ جو بن کے قطرۂ ناچیز رہ گیا
برپا کرے گا جوش میں طوفاں ادھر ادھر
ہوگی دراز آنکھ مچولی کی داستاں
'لوفر' جو ہوں گے سلسلہ جنباں ادھر ادھر
بو موتیے کی آئے گی موتی کے ہار سے
وہ گل جو ہوگا سرو خراماں ادھر ادھر
ابلیس ہوگا مست مئے جام حریت

ننگا پھرے گا لشکر شیطاں ادھر ادھر
'نطشے' کی روح ہوگی 'سپرمین شپ' کے ساتھ
ہوگا 'خودی' کا مرغ پریشاں ادھر ادھر

نظمیں

۱۱ یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے

تعزیت ہو غیر مسلم کی تو یہ جائز نہیں
اور ایصال ثواب و فاتحہ جائز نہیں
منحرف جو اس سے ہو وہ مرتد انجام ہے
منکر آیات قرآں دشمن اسلام ہے
ایسی حرکت کا حقیقی مدعا چیلنج ہے
یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے
اس امارت اور جمعیۃ کے علمائے کرام
اس ادارہ شرعیہ کے مفتیان خوش مقام
ایسی حرکت پر اگر خاموش ہوں زیبا نہیں
اپنے حجروں میں اگر روپوش ہوں زیبا نہیں
ان کو رکھنا چاہئے چہروں کو اپنے بے نقاب
ہو زباں پر ان کے جاری معنی ام الکتاب
نصرت دین شہ خیرالوریٰ ہے ان کا نام
حفظ آئین محمد مصطفیٰ ہے ان کا کام
وہ نہ بولیں گر تو مجرم ہیں خدا کے سامنے
اپنے خالق مالک ارض و سما کے سامنے

[۲] ۱۵؍اگست کے نام

تیرا افسانہ ہے آزادی کا عنواں ہونا

تخت دہلی پہ وہ اردو کا نمایاں ہونا
رہنا آزاد کا مرکز میں وزیرِ تعلیم
خانۂ جہل کا انگشت بدنداں ہونا
تیرے دربار میں پکھراج پری کا وہ ناچ
اس پہ شہزادۂ گلفام کا حیراں ہونا
چھوٹ جانا تری دہلیز پہ قارونوں کا
فاقہ مستوں کا ترے داخل زنداں ہونا
کفر و اسلام کے جھگڑوں میں تری سعی جمیل
دونوں جانب وہ ترا تا حد امکاں ہونا
تیری پالیسی کے ہے عین مطابق اب تک
بھائی کا بھائی سے ہم دست و گریباں ہونا
تیری برکت سے گرانی کا ستوں قائم ہے
تو نے غلہ کو سکھایا نہیں ارزاں ہونا
تیری مرضی سے ہے یوپی میں سرِ شام و سحر
زلف اردوئے معلیٰ کا پریشاں ہونا
ثانوی درجہ اردو پہ بہت خوش ہے بہار
اس کی قسمت تھی ترا بندۂ احساں ہونا
مردِ مومن ہے وہی صاحب ایماں ہے وہی
قومی یکجہتی پہ آئے جسے قرباں ہونا
نکسلائٹ بھی ترے اور پولس بھی تیری
دونوں کانٹوں کو ہے گلزار و گلستاں ہونا
در لیلیٰ پہ ترے مجنوں کا وہ روزۂ موت
ایٹمک ایج میں ذرہ کا درخشاں ہونا
تیری جگنی کا چمک کر وہ عروج پرواز
تیرے جگنو سے وہ جنگل میں چراغاں ہونا
تیرے ساحل پہ ہے بھیگے ہوئے الو کی طرح

جس کو اے پندرہ اگست آتا تھا طوفاں ہونا
لکھ دیا اس نے تجھے ایک محبت نامہ
تھا سٹائر میں جو واقف کو غزل خواں ہونا

[۳] مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں

یہی حدیث تھی فردوس رنگ و بو ان کی
اسی نے جان گلستاں بنا دیا ان کو
نسیم صبح تھی گڑھ تھے اور کیا تھے وہ
اسی کے فیض نے طوفاں بنا دیا ان کو
وہ عندلیب نوا سنج باغ فطرت تھے
اسی نے شیرنیستاں بنا دیا ان کو
حبیب اور وہ تھے نبی اے آسن لیکن
اسی نے حامل قرآں بنا دیا ان کو
اسی سے سنت یوسف نے ان کو پیار کیا
اسی نے زینت زنداں بنا دیا ان کو
اسی سے ان کی نوا تھی صدائے اسرافیل
اسی نے حشر بداماں بنا دیا ان کو
یہی حدیث محمد علی کا جوہر تھی
اسی نے صاحب عرفاں بنا دیا ان کو

[۴] حالات حاضرہ کی بے ہودہ سامانیاں

روز وصال بھی شب ہجراں ہے آج کل
فتنہ فساد کار نمایاں ہے آج کل
اصغر نے جو کہا تھا وہ بالکل درست ہے
کانٹوں کو بھی غرور گلستاں ہے آج کل
اولاد بابری کو مٹا دیں گے ہیجڑے
چیلنج یہ بنام مسلماں ہے آج کل
کووں کی کائیں کائیں میں اعلان صبح ہے

داغ سیاہ مہر درخشاں ہے آج کل
نفرت ہے اتحاد سے ہر بدمعاش کو
اس کاروبار زیست میں نقصاں ہے آج کل
سایہ ہے اس پہ گیسوئے سرمایہ دار کا
بالکل سیاہ شام غریباں ہے آج کل
ہر چیز کی گرانی ہے سربرفلک نہ پوچھ
لے دے کے اپنا خون ہی ارزاں ہے آج کل
ہر سمت ہُن برستی ہے رتھ کے جلوس پر
یہ لیڈری بھی گنج فراواں ہے آج کل
کتنا حسیں ہے نقشہ ارباب انتظام
تصویر یار پردۂ عریاں ہے آج کل
دیتی ہے گڑھوں کی صدا عندلیب بھی
مرغ جنون جنگ پرافشاں ہے آج کل

[۵] علامہ اقبال مرحوم کی یاد اور منہ بولتی پیروی

نمازوں میں ہے رمضانی خودی کی
ہے روزہ میں فراوانی خودی کی
ہر اک مشکل ہے آسانی خودی کی
کہ دانائی ہے نادانی خودی کی
حقیقت میں نے پہچانی خودی کی
مری دادی جو تھیں نانی خودی کی
جو دیکھے گل بدامانی خودی کی
کرے رضواں بھی دربانی خودی کی
یہ پیروڈی ہے لاثانی خودی کی
حکیمی نے مسلمانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

[۶] معلوم نہیں کیوں؟

چالاک ہے ، عیار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جو شخص ہے مکار ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے نور ہے ہر صبح تو بے رنگ ہے ہر شام
دن رات سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں؟
ہر شخص پڑوسی کا گلا گھونٹ رہا ہے
یہ حاصل اخبار ہے معلوم نہیں کیوں؟
کرفیو بھی ہے اور فوج بھی امن واماں بھی
پنہاں بھی پدیدار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جب ختم ہوئی گرمی بازار محبت
دل اس کا خریدار ہے معلوم نہیں کیوں؟
ہے فلسفہ تسبیح کا معلوم نہیں کیا؟
یہ رشتہ زنار ہے معلوم نہیں کیوں؟
کہتے ہیں وہ سن کر مرے اشعار کو واقف
ہر شعر مزیدار ہے معلوم نہیں کیوں؟

[۷] حالات حاضرہ کے گرد و پیش طنز و تغزل

نسیم صبح گر پھولوں کو خنداں کر نہیں سکتی
تو زیادہ دیر تک سیر گلستاں کر نہیں سکتی
اگر مردہ ضمیروں کے عقب میں میخ در کف ہوں
تو ملت اپنی کس مشکل کو آساں کر نہیں سکتی
ہے قوم مسلم خستہ کو الفت ٹکنالوجی سے
مگر وہ بابری مسجد کو قرباں کر نہیں سکتی
ہیں شائستہ چمن میں ہر طرف اٹکھیلیاں اس کی
صبا اردو کی زلفوں کو پریشاں کر نہیں سکتی
ہوئی لیلیٰ بھی عاشق حضرت مجنوں پہ بالآخر
مگر وہ چاک دامان وگریباں کر نہیں سکتی

[۸] ایک برخود غلط دوست کے نام

آپ قطرہ سے اگر موج میں دریا ہو جائیں
لاکھوں طوفان جو پنہاں ہیں وہ پیدا ہو جائیں
اشک اتج میں گر آپ بھی ذرہ ہو جائیں
مرکز کثرت انوار تماشا ہو جائیں
ہر طرف امت مرحوم ہو خاکم بدہن
آپ اگر حضرت اقبال کا شکوہ ہو جائیں
چاہیں گر آپ علاج دل مسلم کرنا
درد ملت میں گراں قدر اضافہ ہو جائیں
آپ اسٹیج پہ اٹھلاتے ہوئے آئیں اگر
انہیں قدموں کی قسم کیا سے ابھی کیا ہو جائیں

[۹] کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

کہنے لگے جمن سے کل حضرت درگاہی
اللہ کرے کم ہو کچھ تیری کم آگاہی
اس دور کی فطرت ہے عیاری و مکاری
بدگوئی و بدبینی بدخوئی و بدخواہی
اب طائر لاہوتی عنقائے تصور ہے
جب آگئی شاہیں کے پرواز میں کوتاہی
جب صوفی و ملا ہوں دربار وزارت میں
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

[۱۰] دورخی چال کی بازی ہے سیاست اے دوست

دورخی چال کی بازی ہے سیاست اے دوست
یہی افسانہ ہے دنیائے حقیقت اے دوست
عشق ہو جائے اگر تجھ کو ڈبل ڈیلنگ کی
تیرے ہاتھوں کا کھلونا ہو وزارت اے دوست
ذوق کی قبر پہ ہوتا شہ دہلی افسوس

اور پٹنہ میں ہوا جشن ظرافت اے دوست
حشر کیا ہوگا بتا مسلم۔ شوریدہ کا
جب رگوں میں نہ رہا خون حمیت اے دوست
حال پنجاب کا معلوم ہے کیا کہنا ہے
اس کے فتنوں میں ہے انداز قیامت اے دوست
اپنا پیغام زمانے میں سنا دے سب کو
ہم ہیں منجملہ ارباب سیاست اے دوست

اعترافات واعزازات

* اپریل ۱۹۸۳ء: محکمہ راج بھاشا، بہار سے تاحیات چار سو روپے ماہوار وظیفہ جاری۔
* ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۸ء: خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ کے زیر اہتمام ''ایک شام واقف کے نام'' کا انعقاد۔

بعد از مرگ:

* ۱۸/ستمبر ۱۹۹۴ء: ''حلقہ احباب'' آرا کے زیر اہتمام یوم واقف کا انعقاد۔
* ۱۹۹۶ء: ''علامہ واقف عظیم آبادی: حیات وخدمات'' قمر ثاقب کے تحقیقی مقالے پر بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ۔
* ۱۹۹۶ء: ''زبان وادب''، پٹنہ جلد ۲۲ شمارہ ۲-۱ واقف عظیم آبادی پر خصوصی گوشہ۔
* جنوری ۲۰۰۳ء: شعری مجموعہ ''لطف ستم'' (مرتبین: سید جاوید حسن رزیا تبسم) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۶ء: ''مضامین واقف عظیم آبادی'' (مرتب: اکبر امام کاشف) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۷ء: ''رازہائے درون پردہ'' (مرتب: اکبر امام کاشف) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۸ء گلدستۂ نعت ومنقبت
* ۲۰۱۱ء طنزیات واقف (واقف آرٹ کا انتخاب)
* ۱۸/مارچ ۲۰۱۸ء: اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، بہار پٹنہ کے زیر اہتمام واقف یادگاری تقریب۔

Monograph-6

Allama Waaqif Azeemabaadi

By Dr. Nasim Akhtar

دبستان بہار کی ایک اہم ادبی وشعری شخصیت کا نام واقف عظیم آبادی ہے۔ان کی پیدائش ۸رمارچ ۱۹۱۶ء کو ارول (جہان آباد) میں ہوئی۔۴رسال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا تو ان کی والدہ ان کو لے کر آرہ چلی آئیں اور محلہ چودھرانہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوگئیں۔ جہاں اُن کی عمر کا طویل حصہ گزرا۔ ۱۹۶۶ء میں وہ شادی کے بعد اپنی سسرال گولک پور، پٹنہ میں ہی بس گئے۔ اسی لئے کچھ لوگ ان کو واقف عظیم آبادی اور کچھ لوگ واقف آروی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

واقف عظیم آبادی کو فارسی، عربی اور اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ سخنور تھے۔ طویل عرصے تک پٹنہ کے روزنامہ 'سنگم'، 'صدائے عام'، 'قومی تنظیم' اور 'ہمارا نعرہ' میں واقف آرٹ کے عنوان سے مزاحیہ قطعات لکھتے رہے اور علامہ واقف کے نام سے شہرت مقبولیت اور عزت حاصل کرتے رہے۔ وہ ایک قادر الکلام اور غضب کے ذہین شاعر تھے۔ وہ فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ لوگ اُن سے گھنٹے بھر میں طویل سہرے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ اس فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

واقف عظیم آبادی بڑے کثیر المطالعہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کے حامل شاعر وادیب تھے۔ ان کی علمی و دانشورانہ اہمیت کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کو ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک روزانہ لائبریری میں مدعو کیا اور انھیں اپنی یادداشت قلم بند کرنے کو کہا۔ واقف کی یہ قیمتی تحریر لسانی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی اعتبار سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہے اور یہ خدا بخش لائبریری میں بارہ جلدوں میں محفوظ ہے۔

اس فرد نامہ کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر ایک اچھے محقق، مبصر، صحافی، ادیب اور ناقد ہیں۔ ا
زبان صحافت اور ادب سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک بہترین محقق ہیں اور ان کی تحریر
تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ ملک کے صف اول کے دانشوران ادب اور ناقدین نے نسیم اخت
تحریر وتصنیف کی ستائش کی ہے۔ ۱۔ تاثرات ۲۰۰۲ء، ۲۔ نیپال میں اردو ۲۰۰۴ء، ۳۔ تلاش وتصنیف
۲۰۱۳ء، ۴۔ طرز سخن ۲۰۱۴ء، ۵۔ باتیں ۲۰۱۵ء، ۶۔ رنگ وآہنگ ۲۰۱۶ء تحقیقی نوعیت کی قابل مط
کتابیں ہیں۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना